فضل و رحمت سے خود دور فرما دے گا ورنہ کبائر و صغائر سب تمھارے اعمال نامے میں درج ہوں گے اور سب کا تمھیں حساب دینا ہوگا۔

صغائر سے بچنے کی راہ بھی کبائر سے اجتناب ہے

یہاں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ صغائر سے بچنے کی راہ بھی یہی ہے کہ آدمی کبائر سے اجتناب کرے۔ جو آدمی اپنے ہزاروں کے قرضے چکاتا رہتا ہے وہ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ کسی کے پانچ روپے دبا کر نادہند کہلانے کی ذلت گوارا کرے۔ برعکس اس کے جو لوگ کبائر کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی نیکیوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں ان کا حال زندگی بھر یہ رہتا ہے کہ مچھر کو چھانتے رہتے ہیں اور اونٹ کو نگلتے رہتے ہیں۔ دوسروں کو تو یہ زیرے اور سونف تک کی زکوٰۃ کا حساب سمجھاتے ہیں لیکن خود یتیموں کے مال اور اوقاف کی آمدنیوں سے اپنی کوٹھیاں بنواتے اور ان کو سجاتے ہیں۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا۔ ۳۲

تنافس کا اصلی میدان اکتسابی صفات کا میدان ہے

معاشرے میں بے شمار کشمکشیں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ کون سا میدان قسمت آزمائی اور جد و جہد کا ہے اور کون سا نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلط ارمان اور ایک اندھا بہرا حوصلہ لوگوں کو ایسے میدانوں میں ڈال دیتا ہے جن میں آدمی کی ساری جد و جہد اور اس کی تمام قابلیت و صلاحیت ایک لاحاصل تصادم اور بے فائدہ تنازع کی نذر ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو ان کی خلقی صفات کے لحاظ سے بعض لوگوں پر ترجیح دی ہے۔ مثلاً بعض کو خوب صورت پیدا کیا، بعض کو بدصورت، بعض کو سلیم الاعضا پیدا کیا بعض کو ناقص الاعضا، بعض کو امیر گھرانوں میں پیدا کیا بعض کو غریب گھرانوں میں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں خلقی ہیں۔ ان میں مقابلے اور تنافس کی لاگ ڈانٹ تلخی اور ناگواری کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح کسی کو مرد بنایا، کسی کو عورت۔ یہ چیز بھی خلقی ہے۔ اگر عورت مرد بننے کی کوشش کرے یا مرد، عورت، تو یہ بھی نری حماقت ہے۔ علیٰ ہذا القیاس خدا نے اپنے قانون میں ہر ایک کے لیے حدود و حقوق معین کر دیے ہیں۔ یہ حقوق و حدود فطرت اور حکمت پر مبنی ہیں۔ اگر مساوات طلبی کے غلط جوش میں ان حقوق اور حدود کو لانگنے کی کوشش کی جائے، عورت چاہے کہ مجھے مرد کے برابر حصّہ ملے، اقربا چاہیں کہ سب کا ایک ہی درجہ قرار پائے تو یہ بھی فطرت اور خدا کی حکمت سے جنگ ہے جس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا کہ سارا نظام تلپٹ ہو کر رہ جائے۔

آج دنیا میں جو ابتری و انتشار، جو تصادم و تنافس اور جو قتل و نہب ہے زیادہ تر اسی غلط اندیشی اور حدنا شناسی کا نتیجہ ہے۔ قرآن نے اس آیت میں یہی بتایا ہے کہ تنافس کا میدان خلقی صفات یا فطری ترجیحات کا نہیں بلکہ اکتسابی صفات کا میدان ہے۔ یہ میدان نیکی، تقویٰ، عبادت، ریاضت، توبہ،

انابت یا جامع الفاظ میں ایمان و عمل صالح کا میدان ہے ۔ اس میں بڑھنے کے لیے کسی پر کوئی روک نہیں ہے۔ مرد بڑھے وہ اپنی جدوجہد کا پورا پورا ثمرہ پائے گا ۔ عورت بڑھے وہ اپنی سعی کا پھل پائے گی۔ آزاد، غلام، بانو، باندی، شریف، وضیع، اعلیٰ، بصیر سب کے لیے یہ میدان یکساں کھلا ہوا ہے ۔ اگر کسی میں کچھ فطری اور خلقی رکاوٹیں ہیں تو اس کے کسر کا جبر بھی یہاں موجود ہے ۔ خدا نے خلقی طور پر جو فضیلتیں بانٹی ہیں ان سے ہزارہا اور لکھو کھہا درجے زیادہ اس کا فضل بیان ہے تو جو فضیلت کے طالب ہیں وہ اس میدان میں اتریں اور خدا کے فضل کے طالب بنیں (وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ) دینے والا سب کی طلب، سب کے ذوق و شوق اور سب کی نیت اور سب کے اخلاص سے واقف ہے اور اس کے خزانے میں نہ کمی ہے، نہ وہ دینے میں بخیل ہے تو غلط میدان میں اپنی محنت برباد کرنے سے کیا حاصل ہے جس کو قسمت آزمائی کرنی ہو اس میدان میں کرے ۔ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْھُمْ نَصِيْبَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا (۳۳)

لفظ مولیٰ کا مفہوم

لفظ 'مولیٰ' عربی میں بہت وسیع معنوں میں آتا ہے ۔ زیادہ تر اس کا تعین موقع و محل اور قرینے سے ہوتا ہے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد ہر مورث کے ورثہ ہیں۔

خدا کے مقرر کردہ وارث ہی اصلی وارث ہیں

اس آیت میں اشارہ تقسیم وراثت کے اس ضابطے کی طرف ہے جو آیت ۷ میں مذکور ہے ۔ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ الایۃ اس حوالے سے مقصود اس کو مزید موکد کرنا ہے کہ ہر مورث کے جو وارث خدا نے ٹھہرا دیے ہیں وہی اصلی وارث ہیں۔ اب ان میں اپنے ذاتی رجحانات کی بنا پر نہ کسی ترمیم و تبدیلی کی گنجائش ہے اور نہ ان کے مقررہ حصوں میں کسی کمی بیشی کی ۔ اگر کسی نے کسی غیر وارث سے کچھ دینے دلانے کا وعدہ کر رکھا ہے تو اس کو وہ حصہ دے جو اس کا ہے ۔ اس کا حصہ سے مراد ظاہر ہے کہ وہی حصہ ہو سکتا ہے جس کی مورث کو وصیت کی اجازت ملی ہوئی ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تقسیم سے علیحدہ کر رکھا ہے ۔ یہ حصہ در حقیقت ایسے ہی لوگوں کے لیے خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھوڑا گیا ہے ۔ اس وجہ سے اس کے لیے 'نَصِيْبَھُمْ' کا لفظ استعمال ہوا ۔ آخر میں اپنی صفت 'عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا' کا حوالہ بطور تنبیہ دیا ہے کہ بے جا جانبداری کی مخفی سے مخفی کوشش بھی اللہ کے علم سے مخفی نہیں رہ سکتی ۔ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ہر جلی و خفی سے آگاہ ہے۔

۱۶ - آگے کا مضمون —— آیات ۳۴-۳۵

خاندان کی تنظیم کے لیے ہدایات

اوپر 'وَلَا تَتَمَنَّوْا' الایۃ، میں عورت اور مرد دونوں کو اپنے اپنے فطری اور شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے حصولِ سعادت و کمال کی جدوجہد کی جو ہدایت فرمائی تھی اسی ہدایت کو خاندانی زندگی کی

تشکیل و تنظیم کے لیے رہنما اصول قرار دے کر اب یہ خاندان کی تنظیم کے لیے ہدایات دی جا رہی ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ معاشرہ خاندانوں سے مرکب ہوتا ہے اور معاشرے ہی سے ریاست وجود میں آتی ہے۔ گویا خاندان ہی وہ چیز ہے جو معاشرہ اور پھر ریاست کی بنیادی اینٹ ہے۔ اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ یہ پہلی اینٹ نہایت صحیح رکھی جائے۔ اگر یہ ذرا بھی کج ہوگئی تو۔ ع "تا ثریا می رود دیوار کج"۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۳۴-۳۵

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۚ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۚ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

ترجمۂ آیات ۳۴-۳۵

مرد عورتوں کے سرپرست ہیں، بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنے مال خرچ کیے۔ پس جو نیک بیبیاں ہیں وہ فرمانبرداری کرنے والی، رازوں کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں بوجہ اس کے کہ خدا نے بھی رازوں کی حفاظت فرمائی ہے اور جن سے تمھیں سرتابی کا اندیشہ ہو تو ان کو نصیحت کرو اور ان کو ان کے بستروں میں تنہا چھوڑو اور ان کو سزا دو۔ پس اگر وہ تمھاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف راہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک اللہ بہت بلند اور بہت بڑا ہے۔ ۳۴

اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان افتراق کا اندیشہ ہو تو ایک پنچ مرد کے لوگوں میں سے مقرر کرو اور ایک پنچ عورت کے لوگوں میں سے۔ اگر دونوں اصلاح کے طالب ہوئے تو اللہ ان کے درمیان سازگاری پیدا کر دے گا۔ بے شک اللہ علیم و خبیر ہے۔ ۳۵

۱۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاهْجُرُوْھُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا (۳۴)

'قام علی' کا مفہوم

عربی میں 'قام' کے بعد 'علی' آتا ہے تو اس کے اندر نگرانی، محافظت، کفالت اور تولیت کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ میں بالاتری کا مفہوم بھی ہے اور کفالت و تولیت کا بھی اور یہ دونوں باتیں کچھ لازم و ملزوم سی ہیں۔

گھر کی ریاست کا سربراہ مرد ہے

گھر کی چھوٹی سی وحدت بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ جس طرح ہر ریاست اپنے قیام و بقا کے لیے ایک سربراہ کی محتاج ہوتی ہے اسی طرح یہ ریاست بھی ایک سربراہ کی محتاج ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس ریاست میں سربراہی کا مقام مرد کو حاصل ہو یا عورت کو؟ قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ مقام مرد کو حاصل ہے اور اس کے حق میں دو دلیلیں دی ہیں۔

مرد کی سربراہی کے حق میں دو دلیلیں

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت بخشی ہے۔ مرد کو بعض صفات میں عورت پر نمایاں تفوق حاصل ہے جن کی بنا پر وہی سزاوار ہے کہ قوامیت کی ذمہ داری اسی پر ڈالی جائے۔ مثلاً محافظت و مدافعت کی جو قوت و صلاحیت یا کمانے اور ہاتھ پاؤں مارنے کی جو استعداد و ہمت اس کے اندر ہے، وہ عورت کے اندر نہیں ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث کلی فضیلت نہیں ہے بلکہ صرف وہ فضیلت ہے جو مرد کی قوامیت کے استحقاق کو ثابت کرتی ہے۔ بعض دوسرے پہلو عورت کی فضیلت کے بھی ہیں لیکن ان کو قوامیت سے تعلق نہیں ہے۔ مثلاً عورت گھر در سنبھالنے اور بچوں کی پرورش و نگہداشت کی جو صلاحیت رکھتی ہے وہ مرد نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے قرآن نے یہاں بات ابہام کے انداز میں فرمائی ہے جس سے مرد اور عورت دونوں کا کسی نہ کسی پہلو سے صاحب فضیلت ہونا نکلتا ہے۔ لیکن قوامیت کے

پہلو سے مرد ہی کی فضیلت کا پہلو راجح ہے۔

دوسری یہ کہ مرد نے عورت پر اپنا مال خرچ کیا ہے۔ یعنی بیوی بچوں کی معاشی اور کفالتی ذمہ داری تمام اپنے سر اٹھائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری مرد نے اتفاقیہ یا تبرعاً نہیں اٹھائی ہے بلکہ اس وجہ سے اٹھائی ہے کہ یہ ذمہ داری اسی کے اٹھانے کی ہے۔ وہی اس کی صلاحیتیں رکھتا ہے اور وہی اس کا حق ادا کر سکتا ہے۔

نیک بیبیاں وہ ہیں جو قوام کی اطاعت گزار اور رازدار ہیں۔

مرد کو قوامیت کے منصب پر سرفراز کرنے کے بعد نیک بیبیوں کا رویہ بتایا کہ وہ نہایت فرمانبرداری کے ساتھ اپنے قوام کی اطاعت کرتی، اس کے رازوں اور اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرتی ہیں۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو عورتیں، اس کے بالکل برعکس آج اس بات کے لیے زور لگا رہی ہیں کہ وہ عورت بن کر نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں مرد بن کر رہیں گی وہ صالحات نہیں بلکہ فاسقات ہیں اور انھوں نے اس نظام کو بالکل تلپٹ کر دینا چاہا ہے جس پر عائلی زندگی کی تمام برکتوں اور خوشحالیوں کا انحصار ہے[1]۔

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ کا مطلب

'حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ' کا مطلب ہم نے یہ لیا ہے کہ وہ رازوں کی حفاظت کرنے والی ہیں۔ یہ معنی لینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ 'غیب' کا لفظ راز کے مفہوم کے لیے مشہور ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں ترکیب کلام ایسی ہے کہ 'پیٹھ پیچھے' کے معنی لینے کی گنجائش نہیں، تیسری یہ کہ عورت اور مرد کے درمیان رازوں کی امانت داری کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا مسئلہ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے قدرتی امین ہیں، بالخصوص عورت کا مرتبہ تو یہ ہے کہ وہ مرد کے محاسن و معائب، اس کے گھر در، اس کے اموال و املاک اور اس کی عزت و ناموس ہر چیز کی ایسی رازدان ہے کہ اگر وہ اس کا پردہ چاک کرنے پہ آجائے تو مرد بالکل ہی ننگا ہو کر رہ جائے۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس صفت کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔ اس کے ساتھ بما حفظ اللہ کا جو اضافہ ہے اس سے اس صفت کی عالی نسبی کا اظہار مقصود ہے کہ ان کی اس صفت پر خدا کی صفت کا ایک پرتو ہے اس لیے کہ خدا نے بھی اپنے بندوں اور بندیوں کے رازوں کی حفاظت فرمائی ہے ورنہ وہ لوگوں کا پردہ چاک کرنے پر آجاتا تو کون ہے جو کہیں منہ دکھانے کے قابل رہ جاتا۔

نشوز کی حقیقت

'نشوز' کے معنی سر اٹھانے کے ہیں لیکن اس لفظ کا غالب استعمال اس سرتابی و سرکشی کے لیے ہوتا ہے جو کسی عورت کی طرف سے اس کے شوہر کے مقابل میں ظاہر ہو۔ اگر کسی عورت کے رویے سے ظاہر ہو کہ وہ سرکشی کی راہ پر چل پڑی ہے تو مرد چونکہ قوام ہے اس وجہ سے اس کو عورت کی تادیب کے لیے بعض تادیبی اختیارات دیے گئے ہیں۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ قرآن نے یہ اختیارات صرف اس صورت کے لیے دیے ہیں جب نشوز کا اندیشہ ہو۔ نشوز، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، عورت کی ہر کوتاہی!

---

[1] مساوات مرد و زن کے جدید نظریے کے ہر پہلو پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب 'اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام' میں کی ہے تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

غفلت یا بے پروائی یا اپنی شخصیت اور اپنی رائے اور ذوق کے اظہار کی قدرتی خواہش کو نہیں کہتے۔ نشوز یہ ہے کہ عورت کوئی ایسا قدم اٹھاتی نظر آئے جو مرد کی قوامیت کو چیلنج کرنے والا اور جس سے گھر کی مملکت میں بدامنی و اختلال پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ اگر ایسی صورت پیدا ہوتی نظر آئے تو مرد تین صورتیں اختیار کر سکتا ہے اور قرآن کا انداز بیان دلیل ہے کہ ان تینوں میں ترتیب و تدریج ملحوظ ہے۔

نشوز کی صورت میں مرد کے تادیبی اختیارات

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ نصیحت و ملامت کرے۔ قرآن میں 'وعظ' کا لفظ ہے جس کے اندر فی الجملہ زجرو توبیخ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ اگر اس سے کام چلتا نظر نہ آئے تو دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ان سے بے تکلفانہ قسم کا خلا ملا ترک کر دے تاکہ انھیں اندازہ ہو جائے کہ انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو اس کے نتائج دور رس ہو سکتے ہیں۔ اگر معاملہ اس سے بھی بنتا نظر نہ آئے تو آخری درجے میں مرد کو جسمانی سزا دینے کا بھی اختیار ہے۔ لیکن یہ صرف اس حد تک ہونی چاہیے جس حد تک ایک معلّم و مؤدب اپنے کسی زیر تربیت شاگرد کو دے سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے 'غیر مبرح' کے الفاظ سے اس کی حد واضح فرما دی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سزا ایسی نہ ہو کہ وہ کوئی پائدار اثر چھوڑ جائے۔

اصلاح کے بعد پچھلی کدورتیں بھلادی جائیں

مرد کے تادیبی اختیارات کی یہ آخری حد ہے۔ اگر اس کا نتیجہ مفید مطلب برآمد ہو، عورت بغاوت کے بجائے اطاعت کی راہ پر آجائے، تو پچھلی کدورتیں بھلا دینی چاہئیں۔ اس سے انتقام لینے کے بہانے نہیں ڈھونڈنے چاہئیں۔ مرد کو اپنی قوامیت کے زعم میں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ سب سے بلند اور سب سے بڑا خدا ہے۔ جب وہ قیم السمٰوٰت والارض ہو کر ہم سب کے نشوز سے درگزر فرماتا اور توبہ و اصلاح کے بعد سب کی نافرمانیوں کو معاف کر دیتا ہے تو بندے اپنی قوامیت کی لے حد سے آگے کیوں بڑھائیں۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا (۳۵)

اصلاح احوال کی ایک اور تدبیر

اگر مرد وہ سارے جتن، جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئے، کرنے کے بعد بھی عورت کے 'نشوز' پر قابو نہ پا سکا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ خلیج اختلاف بہت وسیع ہے اور تعلقات ٹوٹنے کی حد پر پہنچے ہوئے ہیں۔ لیکن اس حد پر پہنچ جانے کے بعد بھی شریعت نے مرد کو یہ اجازت نہیں دی ہے کہ وہ بیوی کو طلاق دے کر اس سے پیچھا چھڑا لے۔ اسلام، میاں بیوی کے رشتے کو معاشرے کے استحکام کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے ٹوٹنے کو صرف اسی صورت میں گوارا کرتا ہے جب اصلاح کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کر چکنے کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ اب اس کا جڑا رہنا ناممکن یا مزید فساد کا باعث ہے۔ چنانچہ شوہر کی کوششوں کی ناکامی کے بعد اصلاح احوال کے لیے ایک دوسری تدبیر اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی۔ یہ ہدایت میاں بیوی کے قبیلہ برادری اور ان کے رشتہ داروں اور خیر خواہوں کو دی گئی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنے اثرات سے کام لے کر اس بگاڑ کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اس کی عملی شکل یہ بتائی کہ ایک پنچ میاں کے

رشتہ داروں میں سے منتخب کیا جائے، دوسرا بیوی کے خاندان میں سے۔ یہ دونوں مل کر اصلاح کی کوشش کریں۔ بسا اوقات فریقین جس جھگڑے کو خود طے کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے دوسرے خیرخواہوں کی مداخلت سے وہ طے ہو جاتے ہیں۔ فریقین کو ان کی غیرجانبداری اور خیرخواہی کا احترام بھی کرنا پڑتا ہے اور بے جا ضد پر دوسروں کی ملامت کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ شکل زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔

میاں اور بیوی کو ترغیب مصالحت

اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا میں مراد اگرچہ حکمین بھی ہو سکتے ہیں لیکن میرا رجحان اس طرف ہے کہ اس سے مراد میاں بیوی ہی ہیں یعنی اگر یہ دونوں اپنی ضد چھوڑ کر اصلاحِ احوال کے طالب ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان میں سازگاری پیدا کر دے گا۔ یہ درحقیقت نہایت بلیغ اسلوب سے میاں بیوی کو تشویق و ترغیب ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور افتراق کے بجائے خدائے کریم و کارساز کی طرف سے سازگاری کے طالب بنیں۔

اس آیت میں ہمارے نزدیک خطاب، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، میاں بیوی کے خویش واقارب اور ان کی قوم و قبیلہ کے بڑے بوڑھوں سے ہے اور ان پنچوں کا اختیار تمام تر اصلاح حال کی کوشش ہی تک محدود ہے۔ اس کوشش کی ناکامی کے بعد شوہر اپنے شرعی اختیارات کے مطابق خود بھی کوئی قدم اٹھا سکتا ہے اور معاملہ عدالتی نوعیت کا ہو تو عدالت میں بھی جا سکتا ہے۔ البتہ اس بات کی گنجائش ہے کہ کوئی معاملہ عدالت میں جانے کے بعد عدالت کی طرف سے کسی پنچایت کے حوالہ کر دیا جائے اور عدالت پنچایت کو فیصلہ کا اختیار بھی تفویض کر دے۔

آخر میں علیم و خبیر کی صفات کے حوالے سے مقصود ہر ایک کو تنبیہ کرنا ہے کہ خدا اچھی طرح باخبر ہے کہ اس قضیے میں کس کا رول کیا رہا ہے اور اسی کے مطابق وہ اس کے ساتھ معاملہ کرے گا۔

۱۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۳۶-۴۳

اب آگے یہ خاتمۂ باب کی آیات ہیں۔ معاشرتی احکام و ہدایات کا سلسلہ جو شروع سے چلا آ رہا تھا وہ ان آیات پر ختم ہو رہا ہے جس طرح اللہ سے ڈرتے رہنے کی ہدایت سے اس باب کا آغاز فرمایا تھا اسی طرح اللہ کی عبادت کرتے رہنے کی ہدایت پر اس کو ختم کیا۔ اللہ تعالیٰ کا حق سب سے بڑا ہے جو لوگ اس حق کو کما حقہٗ ادا کرتے رہیں گے درحقیقت وہی دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی توفیق پائیں گے۔ چنانچہ اس حق کی یاددہانی کے بعد بالاجمال والدین، اقربا، یتامیٰ، مساکین، پڑوسی، مسافر اور لونڈی غلام سب کے حقوق کی یاددہانی فرما دی۔ اللہ کا حق اس کی عبادت ہے اور اس کو باطل کرنے والی چیز شرک ہے اس وجہ سے اس حق کی یاددہانی کے ساتھ شرک کی نفی کر دی۔ بندوں کا سب سے بڑا حق ان کے ساتھ

احسان اور ان کے لیے انفاق ہے۔ بخل، تکبر اور ریا اس کے ہادم ہیں اس وجہ سے احسان وانفاق کی تاکید کے ساتھ ان چیزوں کی نفی کر دی۔ اس کے بعد انفاق کی حوصلہ افزائی کے لیے فرمایا کہ یہ سودا خسارے کا سودا نہیں ہے۔ جو ایک خرچ کرے گا، دس پائے گا۔ پھر تنبیہ فرما دی کہ اس رسول کے ذریعے سے انذار و تبلیغ کا حق ادا ہو چکا ہے جواب بھی نہیں سنیں گے وہ سوچ لیں کہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس دن اللہ سب رسولوں کو ان کی اُمتوں پر گواہ ٹھہرا کر پوچھے گا کہ تم نے اپنی اپنی اُمتوں کو کیا دعوت دی اور انھوں نے کیا جواب دیا۔ پھر یہی سوال اس آخری اُمت کے متعلق اس آخری رسول سے بھی ہوگا۔ وہ دن ایسا ہوگا کہ نہ کسی کے لیے کوئی جائے پناہ ہوگی اور نہ کوئی شخص کوئی بات چھپا سکے گا۔

آخر میں اللہ کی عبادت، جس کا ذکر اُوپر والی آیت میں گزرا، کے سب سے بڑے مظہر — نماز — کے بعض آداب و شرائط کا ذکر فرمایا۔ ان آداب و شرائط کے ذکر سے مقصود نماز کو اسی طرح مفسدات سے پاک کرنا ہے جس طرح اوپر انفاق کو اس کے موانع و مفسدات سے پاک کیا ہے — اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۶-۴۳

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ ﴿۳۶﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي

وقف النبی علیہ السلام

هٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللّٰهَ حَدِيثًا ﴿٤٢﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوا ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضٰٓى أَوْ عَلٰى سَفَرٍ أَوْ جَآءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَآئِطِ أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَآءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٤٣﴾

ع ۶

ترجمۂ آیات ۳۶-۴۳

اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور والدین، قرابت مند، یتیم، مسکین، قرابت دار پڑوسی، بیگانہ پڑوسی، ہم نشین، مسافر اور اپنے مملوک کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اللہ اترانے اور بڑائی مارنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو خود بھی بخل کرتے اور دوسروں کو بھی بخالت کا مشورہ دیتے ہیں اور اللہ نے اپنے فضل میں سے جو کچھ انھیں دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں، ہم نے ایسے ناشکروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے — جو اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کا ساتھی شیطان بن جائے تو وہ نہایت برا ساتھی ہے۔ ان کا کیا نقصان تھا اگر یہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لاتے اور اللہ نے ان کو جو کچھ بخش رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے! اللہ تو ان سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اللہ ذرا بھی کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا۔ اگر ایک نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا بڑھائے گا اور خاص اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ ۳۶-۴۰

اس دن ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر کھڑا کریں گے! اس دن وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور جنھوں نے رسُول کی نافرمانی کی، تمنا کریں گے کاش ان کے سمیت زمین برابر کر دی جائے اور اس دن وہ خدا سے کوئی بات بھی چھپا نہ سکیں گے۔ ۴۱-۴۲

اے ایمان والو، نشے کے حال میں نماز کے پاس نہ جایا کرو یہاں تک کہ جو کچھ تم زبان سے کہتے ہو اس کو سمجھنے لگو اور جنابت کی حالت میں، مگر یہ کہ بس گزر جانا پیشِ نظر ہو، یہاں تک کہ غُسل کر لو۔ اور اگر تم مریض ہو، یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے یا عورتوں سے ہم صُحبت ہوا ہو، پھر پانی نہ میسر آئے تو کوئی پاک جگہ دیکھو اور اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لو، بے شک اللہ درگزر کرنے والا، بخشنے والا ہے۔ ۴۳

۱۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا (۳۶-۳۸)

'بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا' میں 'ب' اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں احسان کا لفظ 'بر' کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ یعنی یہ احسان ادائے حقوق کے ساتھ ہو، محض چھڈا اتارنے کی کوشش نہ ہو۔ 'ب' کا استعمال لفظ 'بر' کے ساتھ ہی مناسبت رکھتا ہے۔ چنانچہ سورۂ مریم میں ہے وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا (اور اپنے والدین کا فرماں بردار تھا، سرکش اور نافرمان نہ تھا) اردو ترجمے میں اس طرح کے اسالیب کے ترجمے کا حق مشکل ہی سے ادا ہوتا ہے۔

'الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى' : یعنی پڑوسی بھی ہے اور اس کے ساتھ رشتہ داری کا بھی تعلق ہے۔

'الْجَارِ الْجُنُبِ' ۔ 'جُنُب' کے معنی اجنبی کے ہیں یعنی پڑوسی ہے لیکن رشتہ داری اور قرابت کا تعلق اس کے ساتھ نہیں ہے۔

پڑوسی کی تین قسمیں

'الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ' 'جنب' کے معنی پہلو کے ہیں، جو شخص وقتی اور عارضی طور پر بھی کسی مجلس، کسی حلقے، کسی سواری، کسی دکان، کسی ہوٹل میں آپ کا ہم نشین و ہم رکاب ہو جائے، وہ الصاحب بالجنب ہے۔

اسلامی معاشرہ میں ان تینوں قسم کے لوگوں کو ایک دوسرے پر حقوق جوار حاصل ہو جاتے ہیں۔

خدا کا حق سب سے بڑا ہے

ان آیات میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنا حق ادا کرنے کا حکم دیا ہے اس لیے کہ خالق و مالک اور رب ہونے کی وجہ سے اس کا حق سب سے بڑا ہے اور اسی حق کی ادائیگی پر دوسرے حقوق کی ادائیگی کا انحصار ہے۔ جو لوگ خدا کا حق ادا نہیں کرتے وہ دوسروں کے حقوق بھی صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق نہیں پاتے۔ خدا کا حق عبادت ہے اور ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ عبادت میں پرستش اور اطاعت دونوں چیزیں شامل ہیں۔ اس عبادت کے لیے یہ شرط ہے کہ اس میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے اس لیے کہ خدا کی خدائی میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں ہے۔ اگر اس حق میں کسی دوسرے کو شریک کر دیا جائے تو یہ عبادت باطل ہو کر رہ جاتی ہے۔

خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے

خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ انہی کو آدمی کے وجود میں آنے اور اس کی پرورش کا ذریعہ بناتا ہے۔ لیکن ان کا حق عبادت نہیں بلکہ بر و احسان ہے۔ اس کے بعد قرابت مندوں کے حقوق ہیں جو درحقیقت اسی حق سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر یتامیٰ، مساکین اور پڑوسیوں کے حقوق ہیں۔ پڑوسی تین طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو پڑوسی بھی ہے اور قرابت مند بھی، دوسرا وہ جو پڑوسی تو ہے اگرچہ قرابت مند نہیں ہے، تیسرا وہ جو وقتی طور پر کسی سفر یا حضر میں ساتھی اور ہم نشین بن گیا ہے۔ ان سب کے ساتھ احسان کی ہدایت ہوئی۔ پھر مسافر اور غلاموں لونڈیوں کا ذکر ہے۔

قرابت مندوں، مساکین اور پڑوسیوں کے حقوق

لونڈیوں اور غلاموں کے متعلق ہم ذکر کر چکے ہیں کہ غلامی، اسلام کے نظام کا کوئی جزو نہیں ہے اسلام نے وقت کے بین الاقوامی حالات کے تحت اس کو گوارا کیا تھا اور خود اپنے نظام میں غلاموں کی ترقی و بہبود کی ایسی شکلیں تجویز کر دی تھیں جن سے وہ بالتدریج اسلامی معاشرے میں مساوی درجے کے رکن بن جائیں اس آیت میں ان کو بھی احسان کے مستحقوں میں شامل کیا ہے اور مقصود اس سے یہی ہے کہ ان کے متعلق لوگوں کا زاویۂ نگاہ بدلے اور لوگ نیکی اور احسان کے مواقع میں ان کی اصلاح و ترقی کو ایک مستقل مسئلے کی حیثیت سے پیش نظر رکھیں۔

ادائے حقوق کے منافی ذہنیت

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا۔ یہ ادائے حقوق اور احسان کے منافی ذہنیت کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اسباب و وسائل کی فراوانی کو اللہ کا انعام و احسان سمجھتے ہیں ان کے اندر تو شکر گزاری اور تواضع کا جذبہ ابھرتا ہے اور یہ جذبہ ان کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا ہے اسی طرح یہ دوسروں پر احسان کریں چنانچہ وہ لوگوں پر احسان کرتے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے سزاوار بنتے ہیں۔ برعکس اس کے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو خود اپنی قوت و قابلیت اور اپنی تدبیر و حکمت کا ثمرہ سمجھنے لگتے ہیں ان کے اندر تواضع اور شکر گزاری کے جذبے کے بجائے گھمنڈ اور فخر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ لوگوں پر احسان

کرنے کے بجائے ان پر دھونس اور رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے اتراؤں اور کم ظرفوں کو دوست نہیں رکھتا۔ "دوست نہیں رکھتا" کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔

اترانے اور فخر کرنے والوں کی چند خصوصیات

اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ الاية۔ اکڑنے اور فخر کرنے والوں کی یہ چند مزید خصوصیات بیان ہوئی ہیں جو ہم بالترتیب واضح کریں گے۔

پہلی یہ کہ یہ خود بھی بخیل ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں "بخیل" اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں تنگ دل ہو۔ جو شخص دوسروں کے حقوق فیاضی اور کشادہ دلی کے ساتھ ادا کرتا ہے لیکن خود اپنی ذات کے معاملے میں احتیاط اور تنگی برتتا ہے اس کو بخیل نہیں کہتے۔ بخالت کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے مال و اسباب کو خدا کی دین سمجھنے کے بجائے خود اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر تواضع اور شکرگزاری کا وہ جذبہ ہی مردہ ہوجاتا ہے جو فیاضی اور جود و کرم کا اصل محرک ہے۔

بخیل آدمی دوسروں کو بھی بخالت کا مشورہ دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کی فیاضی سے خود اس کی بخالت کا راز فاش ہوتا ہے۔ اپنے اس عیب پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح وہ دوسروں کے حقوق دبائے بیٹھا ہے اسی طرح دوسرے بھی بیٹھے رہیں کہ نہ کوئی ناک والا ہوگا، نہ اس کو نکو بننا پڑے گا۔ قاعدہ ہے کہ جو آدمی بزدل ہوتا ہے وہ دوسروں کو بھی بزدلی ہی کا درس دیتا ہے تاکہ خود اس کی بزدلی کا بھانڈا نہ پھوٹے۔

بخیل مالداروں کا ایک نفسیاتی پہلو

دوسری یہ کہ یہ اللہ کے اس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے ان کو دے رکھا ہے۔ یہ بخیل مالداروں کے ایک نہایت مخفی نفسیاتی پہلو کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ بخیل مالداروں کی خواہش ایک طرف تو یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص پر ان کی ریاست و امارت کی دھونس جمی رہے، دوسری طرف یہ کوشش بھی وہ کرتے رہتے ہیں کہ کوئی شخص ادائے حقوق کے معاملے میں ان کو کوئی ملامت نہ کر سکے۔ چنانچہ یہ ہر ملنے جلنے والے اور ہر طالب و سائل کے سامنے اپنے وسیع اخراجات، کاروبار میں نقصانات، اپنی پھیلی ہوئی ذمہ داریوں اور طالبوں اور سائلوں کی کثرت کا دکھڑا روتے رہتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ہے تو یہ شخص غنی دریا دل لیکن بے چارہ کیا کرے، بڑی بھاری ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اس وجہ سے ہزاروں لاکھوں کی آمدنی رکھنے کے باوجود اس کے پاس بچتا بچاتا کچھ بھی نہیں ہے۔

وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔ ایسے ناشکروں اور کافر نعمتوں کے لیے فرمایا کہ ہم نے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ "ذلیل کرنے والا عذاب" اس وجہ سے کہ یہ اللہ کی نعمت پاکر اس کے شکرگزار اور حق گزار بندے بننے کے بجائے اکڑنے اور اترانے والے اور اس کے فضل کو چھپانے والے بنے۔

دکھاوے کا انفاق کاروباری خرچ ہے

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ الاية۔ یہ بھی اسی سلسلے کی بات ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ یعنی یہ اگر خرچ کرتے ہیں تو محض دکھاوے کے لیے۔ دکھاوے کا خرچ ایک کاروباری خرچ ہوتا ہے۔ اول تو اس کا فائدہ شاذونادر ہی ان لوگوں کو

پہنچتا ہے جو اصلی حقدار ہوتے ہیں اس لیے کہ اصلی حقداروں کے معاملے میں نمائش اور دکھاوے کا کچھ زیادہ موقع نہیں ہوتا۔ پھر منافق کی نماز کی طرح نمائش کے انفاق کا بھی کوئی تعلق اللہ تعالیٰ سے نہیں ہوتا۔ اس طرح کے لوگ خدا اور آخرت پر ایمان کے تو مدعی ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں نہ ان کا ایمان خدا پر ہوتا ہے نہ آخرت پر۔ اور انفاق اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہ معتبر ہوتا ہے جو خدا اور آخرت پر ایمان کے ساتھ ہو اس لیے کہ وہی انفاق اس دنیا کے لیے بھی باعثِ خیر و برکت ہے اور وہی آخرت میں بھی موجب خیر و برکت ہوگا۔ جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان سے خالی ہوتے ہیں ان کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے اور جس کا ساتھی شیطان بن جائے اس کے لیے خیر و برکت کا کوئی کام کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۔ ۲۷- بنی اسرائیل۔

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا (۳۹-۴۰)

یہ ان تنگ دلوں اور بخیلوں کی بدقسمتی پر اظہار افسوس ہے کہ یہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے اور اللہ کی راہ میں خود اسی کی بخشی ہوئی دولت کو خرچ کرنے میں بڑا خسارہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ سراسر نفع ہی نفع ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کے عمل سے بے خبر ہے، نہ ذرہ برابر وہ کسی کی حق تلفی کرنے والا ہے بلکہ کسی کی کوئی نیکی ہوگی تو وہ اس کو بڑھا کر کئی گنی کرے گا اور اس پر مزید وہ خود اپنی طرف سے ایک بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ۝ يَوْمَىِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (۴۱-۴۲)

قیامت میں انبیا کی شہادت اپنی امتوں پر

مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اتمامِ حجت کا تعلق ہے اللہ نے اپنے رسول کے ذریعے سے ان کو اپنے دین سے آگاہ کر دیا اور ان پر حجت تمام کر دی۔ اب دین و شریعت سے آگاہ کرنے کے معاملے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے۔ اس اتمام حجت کے بعد بھی اگر یہ لوگ اللہ اور رسول سے منحرف ہو رہے ہیں تو آج تو یہ اپنے کفر و نفاق کو چھپا سکتے ہیں لیکن کل کو یہ کیا کریں گے جب میدانِ حشر میں اللہ تمام امتوں اور ان کے پیغمبروں کو جمع کر کے پیغمبروں سے گواہی دلوا دے گا کہ انھوں نے لوگوں کو دین پہنچا دیا تھا اور اسی طرح کی گواہی تم (خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) اس امت کے لوگوں پر دینے کے لیے کھڑے کیے جاؤ گے۔ اس دن وہ سارے لوگ جنھوں نے کفر اور نافرمانی رسول کا ارتکاب کیا ہوگا یہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ زمین میں دھنس جائیں اور زمین ان کے سمیت برابر کر دی جائے۔ اس دن کوئی شخص خدا سے کوئی بات چھپا نہ سکے گا۔

وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا میں نفی فعل عدم استطاعت فعل کے مفہوم میں ہے۔ کسی بات کو نہ چھپا سکنے کی وجہ یہ ہوگی کہ اس دن مجرموں کے ہاتھ پاؤں اور ان کے تمام اعضاء و جوارح خود ان کے خلاف گواہی دینے کے لیے

بول اُٹھیں گے۔ اس حقیقت کو قرآن نے دوسرے مقام میں یوں واضح فرمایا ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ	یہاں تک کہ جب وہ حاضر ہوں گے تو ان کے خلاف گواہی
سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ (۲۰ فصلت)	دیں گے ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کے رونگٹے

یہاں اس لفظ کے اندر ایک لطیف تعریض بھی پوشیدہ ہے۔ یہ لوگ اللہ کے اس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے ان کو دے رکھا ہے وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۳۷۔ یہاں فرمایا کہ اس دن اللہ سے کوئی چیز بھی چھپا نہ سکیں گے۔ ہر چیز خود بے نقاب اور گواہی دینے کے لیے ناطق ہو جائے گی۔

یہ بات کہ انبیاء قیامت کے روز اپنی اپنی اُمتوں پر گواہ کی حیثیت سے کھڑے کیے جائیں گے قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے بھی ثابت ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ	جس دن اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے پوچھے گا
قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ	کہ تمہیں کیا جواب ملا وہ کہیں گے کہ ہمیں علم نہیں، غیب
الْغُيُوْبِ (۱۰۹۔ مائدہ)	کی باتوں کا جاننے والا تو ہی ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ رسولوں سے قیامت کے دن سوال فرمائے گا کہ جب تم نے اپنی اپنی امتوں کو اللہ کا دین پہنچایا تو انھوں نے دین کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ رسول جواب دیں گے کہ ہم نے تو تیرا دین بے کم و کاست لوگوں کو پہنچا دیا۔ انھوں نے اس دین کے ساتھ کیا معاملہ کیا، اس کا علم تیرے ہی پاس ہے اس لیے کہ غیب کا جاننے والا تو ہی ہے۔

اس شہادت کی پوری حقیقت سیدنا مسیحؑ کی شہادت سے واضح ہو جاتی ہے جو سورۂ مائدہ میں یوں مذکور ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ	جب کہ اللہ پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسٰی، کیا تم نے
قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ	لوگوں سے یہ کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ	بھی معبود ٹھہراؤ؟ وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے،
اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ	یہ مجھ سے کس طرح ہو سکتا ہے کہ میں وہ بات کہوں جس کا
قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِيْ	مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہوگی تو تجھ کو اس
نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ اِنَّكَ	کا علم ہوگا۔ تو میرے دل کی باتوں کو جانتا ہے، میں تیرے
اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا	دل کی باتوں کو نہیں جانتا۔ غیب کی باتوں کو جاننے والا تو
مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ	ہی ہے۔ میں نے ان سے نہیں کہی مگر وہی بات جس کا تو
وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ	نے مجھے حکم دیا یہ کہ اللہ ہی کی بندگی کرو جو میرا بھی رب
فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ	ہے اور تمہارا بھی۔ میں جب تک ان کے اندر رہا اسی بات
عَلَيْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	کی گواہی دینے والا رہا، پھر جب تو نے مجھے وفات دی تو

شَهِيْدًا (۱۱۷-۱۱) ان کا نگران حال تو رہا اور تو ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔
مسلم کی اس آیت سے متعلق روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن مسعودؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سناتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے تو حضورؐ شدت تاثر سے آبدیدہ ہو گئے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عظیم شرف کے ساتھ ساتھ ایک عظیم ذمہ داری کی بھی حامل ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنۡتُمۡ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىۡ سَبِيۡلٍ حَتّٰى تَغۡتَسِلُوۡا ؕ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤى اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَيَمَّمُوۡا صَعِيۡدًا طَيِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِكُمۡ وَاَيۡدِيۡكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوۡرًا (۴۳)

لفظ 'صلوٰۃ' نماز اور موضع نماز دونوں معنی میں

'صلوٰۃ' کے معنی نماز کے ہیں لیکن جس طرح کبھی ظرف بولتے ہیں اور مظروف اس کے مفہوم میں آپ سے آپ شامل ہوتا ہے اسی طرح کبھی مظروف، اگر قرائن موجود ہوں، ظرف پر بھی مشتمل ہو جاتا ہے۔ یہاں دو قرینے موجود ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ 'صلوٰۃ' کا لفظ موضع صلوٰۃ یعنی مسجد پر بھی مشتمل ہے۔ ایک تو یہ کہ فرمایا نشے اور جنابت کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ ظاہر ہے کہ اگر 'صلوٰۃ' سے مراد مجرد نماز ہوتی تو اس کے لیے 'نماز نہ پڑھو' کہہ دینا کافی تھا۔ 'لَا تَقۡرَبُوا' کے الفاظ سے اس مطلب کو ادا کرنے کا کوئی خاص فائدہ سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرا یہ کہ اس کے ساتھ 'اِلَّا عَابِرِىۡ سَبِيۡلٍ' کا استثنا بھی ہے۔ یعنی اگر نماز کی جگہ سے مجرد گزر جانا مدنظر ہو تو اس میں مضائقہ نہیں۔ یہ گزر جانا، نماز کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا بلکہ اس کی واضح مناسبت ہو سکتی ہے تو موضع نماز ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ بعض لوگوں نے اسی عدم مناسبت سے بچنے کے لیے 'عَابِرِىۡ سَبِيۡلٍ' سے مراد حالت سفر کو لیا ہے لیکن یہ محض تکلف ہے۔ اول تو سفر کے لیے یہ تعبیر بالکل اجنبی ہے، دوسرے یہ کہ حالت سفر کے لیے جو رخصت ہے وہ اسی آیت میں 'اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ' کے الفاظ سے مستقلاً بیان ہوئی ہے۔ پھر یہاں اس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔

تحریم شراب کی راہ میں اسلام کا ابتدائی قدم

'سُكٰرٰى' 'سکران' کی جمع ہے۔ 'سکران' شراب کے نشہ میں دھت کو کہتے ہیں۔ نشے کی حالت میں نماز اور موضع نماز سے روک کر اسلام نے تحریم شراب کی راہ میں یہ ابتدائی قدم اٹھایا۔ یہود کے ہاں شراب کی ممانعت صرف اوقات عبادت میں اماموں کے لیے تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس راہ میں اسلام کا پہلا قدم بھی اُن کے آخری قدم سے آگے ہے۔

نشہ عقل کی نجاست ہے، جنابت بدن کی

نشہ اور جنابت دونوں کو ایک ساتھ ذکر کر کے اور دونوں کو یکساں مفسد نماز قرار دے کر قرآن نے اس حقیقت کی طرف رہنمائی فرمائی ہے کہ یہ دونوں حالتیں نجاست کی ہیں، بس فرق یہ ہے کہ نشہ عقل کی نجاست ہے اور جنابت جسم کی۔ شراب کو قرآن نے جو 'رجس' کہا ہے یہ اس کی وضاحت ہو گئی۔

'جُنُب' کا لفظ جس طرح اجنبی کے لیے آتا ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، اسی طرح جُنبی کے لیے بھی آتا ہے اور واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب میں اس کی شکل ایک ہی رہتی ہے۔

تیمم کی حکمت

'تیمم' کے معنی قصد اور رُخ کرنے کے ہیں۔ 'صعید' سطح ارض کو کہتے ہیں۔ مرض، سفر اور پانی نہ ملنے کی صورت میں

طہارت حاصل کرنے کے لیے یہ ہدایت ہوئی کہ کوئی پاک صاف جگہ دیکھ کر چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔ اگرچہ یہ مسح پاکیزگی کے حصول کے نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اصل طریقۂ طہارت کی یاد داشت ذہن میں قائم رکھنے کے پہلو سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ شریعت نے اکثر عبادات میں یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ جب اصلی صورت میں ان کی تعمیل ناممکن یا دشوار ہو تو تشبہی صورت میں ان کی یادگار باقی رکھی جائے تاکہ جب حالات درست ہو جائیں، ان کی طرف پلٹنے کے لیے طبیعت میں آمادگی باقی رہے۔

تیمم کے تین مواقع

تیمم کے یہاں تین مواقع بیان ہوئے ہیں۔ مرض، سفر اور پانی کی نایابی۔ اس سے یہ بات خود بخود نکلتی ہے کہ مرض اور سفر کی حالت میں پانی موجود ہوتے ہوئے بھی آدمی تیمم کر سکتا ہے۔ مرض میں وضو یا غسل سے ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے اس وجہ سے یہ رعایت ہوئی ہے۔ اسی طرح سفر میں مختلف حالتیں ایسی پیش آسکتی ہیں کہ آدمی کو تیمم ہی پر قناعت کرنی پڑے۔ مثلاً یہ کہ پانی نایاب تو نہ ہو لیکن کمیاب ہو۔ اندیشہ ہو کہ اگر غسل وغیرہ کے کام میں لایا گیا تو پینے کے لیے پانی تھڑ جائے گا یا یہ ڈر ہو کہ اگر نہانے کے اہتمام میں لگے تو قافلے کے ساتھیوں سے بچھڑ جائیں گے، یا ریل اور جہاز کا ایسا سفر ہو کہ غسل کرنا شدید زحمت کا باعث ہو۔

حدث اور جنابت دونوں حالتوں میں تیمم کی اجازت

نجاست کی یہاں دو حالتیں مذکور ہوئی ہیں، ایک یہ کہ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡکُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ (یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے) لفظ 'غائط' اصلاً نشیبی زمین کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ قضائے حاجت سے کنایہ ہے اس لیے کہ سادہ دیہاتی زندگی میں لوگ رفع حاجت کے لیے عموماً نشیبی زمینوں اور جھاڑیوں ہی میں جاتے ہیں۔ دوسری اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ (یا تم نے عورتوں سے ملاقات کی ہو) 'ملامست' کے معنی اصلاً چھونے اور ہاتھ لگانے کے ہیں لیکن یہاں یہ کنایہ ہے مباشرت سے۔ نجاست کی ان دونوں حالتوں کے ذکر سے مقصد یہ ہے کہ تیمم ہر قسم کی نجاست میں کفایت کرتا ہے۔ اگر یہ وضاحت نہ ہوتی تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ معمولی حدث میں تو تیمم جائز ہے لیکن دوسری صورت میں جائز نہیں ہے۔

آیت ۴۳ کا موقع و محل اور نظم

اجزا کی وضاحت کے بعد آیت کے موقع اور اس کے نظم کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لیجیے۔ آیت ۳۶ میں اللہ ہی کی عبادت اور والدین و اقربا وغیرہ کے ساتھ احسان و انفاق کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ جو چیزیں عبادت اور احسان و انفاق کو باطل کر دینے والی ہیں مثلاً شرک اور ریا وغیرہ ان کا ذکر فرمایا۔ اب یہ عبادت الٰہی کے سب سے بڑے مظہر۔ نماز۔ کے ان مفسدات کا ذکر فرمایا جو نماز کو باطل کر دینے والے ہیں۔ اوپر شرک کا ذکر ہو چکا ہے جو عقائدی نجاست ہے۔ اس آیت میں ظاہری نجاستوں اور ان کے ازالہ کی تدابیر کی طرف رہنمائی فرمائی، فرمایا کہ نشے اور جنابت کی حالت میں نماز اور جائے نماز کے پاس نہ جاؤ۔ نشے کی حالت میں، جب کہ آدمی کو کچھ ہوش نہیں کہ زبان سے کیا کلمات نکال رہا ہے اور کس کام کے کرنے اور نہ کرنے کا اللہ سے عہد کر رہا ہے، نماز پڑھنا ایک کارِ عبث ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ آیت اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب شراب کی قطعی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ اس حکم نے گویا لوگوں کو متنبہ کر دیا کہ اب شراب

کی قطعی حرمت کے لیے لوگ اپنی تربیت کریں۔ اسی طرح منع فرمایا کہ جنابت کی حالت میں بھی نماز اور جائے نماز کے پاس نہ جاؤ۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جس طرح شراب کا نشہ مبطلِ نماز ہے، اسی طرح جنابت کا کسل اور انقباض بھی اس انشراح اور حضورِ قلب کے منافی ہے جو نماز کے لیے مطلوب ہے۔ اس ممانعت کے ساتھ اتنا استثنا رکھ دیا کہ اس حالت میں کوئی شخص اگر کسی ضرورت سے نماز کی جگہ سے گزر جانا چاہے تو اس کی رخصت ہے۔ جنابت کے لیے طہارت غسل ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص بیمار یا سفر میں ہے یا اسے پانی نہیں مل رہا ہے تو وہ تیمم کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ قضائے حاجت اور مباشرت کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ تیمم ہر قسم کی نجاست میں جائز ہے۔ تیمم کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ کوئی پاک جگہ دیکھ کر چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ یعنی بندوں کے ساتھ اس نے یہ جو رعایت فرمائی ہے تو اس لیے کہ وہ عفو اور غفور ہے۔

۲۰۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۴۴-۵۷

آیت ۴۳ پر، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، اصلاح معاشرہ سے متعلق احکام کا باب ختم ہو گیا۔
آگے اس ردِ عمل کا بیان آ رہا ہے جو ان اصلاحات کے مخالفین کی طرف سے ظاہر ہوا اور ساتھ ہی مسلمانوں کو ایک عظیم مملکت کی بشارت سنائی جا رہی ہے جو معاشرہ کے بلوغ اور کمال کا قدرتی نتیجہ ہے۔ مخالفین میں سب سے پہلے یہود کو لیا ہے اس لیے کہ حامل کتاب ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ انہی کو ان اصلاحات کا حامی ہونا چاہیے تھا لیکن بدقسمتی سے سب سے زیادہ مخالفت انہی کی طرف سے ہوئی چنانچہ ان کی مخالفانہ شرارتوں کا ذکر کرنے کے بعد ان کو براہِ راست خطاب کر کے دھمکی دی کہ اے اہل کتاب، اگر تم اس کتاب پر ایمان نہ لائے تو یاد رکھو کہ تمہارے لیے وقت آ گیا ہے کہ اصحاب سبت کی طرح تم پر لعنت کر دی جائے اور تمہارے چہرے مسخ کر دیے جائیں۔

اس کے بعد یہود کے بعض مشرکانہ اعمال و عقاید اور ان کے اس زعم پر ان کو سرزنش کی ہے کہ یہ اپنے آپ کو ایک برگزیدہ امت سمجھے بیٹھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے عقاید و اعمال خواہ کچھ ہوں، یہ خدا کے محبوبوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں جا براجیں گے۔ فرمایا کہ ان کے اس زعم باطل نے، جو سرتاسر اللہ پر افترا ہے، ان کو ایمان و عمل کی ذمہ داریوں سے بالکل بے فکر کر دیا ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو بندگی کے دائرے سے نکال کر الوہیت کے دائرہ میں شامل کر رکھا ہے۔

اس کے بعد اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ ایک طرف تو تقدس اور برتری کا یہ ادعا ہے، دوسری طرف ذہنی اور اخلاقی پستی کا یہ حال ہے کہ اہل کتاب ہو کر جبت و طاغوت پر ایمان رکھتے اور مسلمانوں کے خلاف حسد میں ایسے اندھے ہو گئے ہیں کہ کفار و مشرکین تک کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دیتے

ہیں۔ فرمایا کہ اگر یہ حسد سے اندھے ہو رہے ہیں تو ہو جائیں، اب تو تقدیر الٰہی کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ اللہ اولاد اسمٰعیل کو کتاب و حکمت اور ایک عظیم خلافت کا وارث بنا کے رہے گا۔

اس کے بعد اولاد اسمٰعیل میں سے جن لوگوں نے یہ دعوت قبول کر لی تھی ان کی حوصلہ افزائی فرمائی اور جو لوگ اس کی مخالفت پر اڑے ہوئے تھے ان کو آخرت کے عذاب کی دھمکی دی۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۴۴-۵۷

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ ﴿۴۴﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَلِيًّا وَكَفَىٰ بِاللَّهِ نَصِيرًا ﴿۴۵﴾ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمَ وَلَٰكِن لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۴۶﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُم مِّن قَبْلِ أَن نَّطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿۴۷﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ﴿۴۸﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُم ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿۴۹﴾ انظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُّبِينًا ﴿۵۰﴾

ع ۸

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ

وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ﴿٥١﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿٥٢﴾ أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾ فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ﴿٥٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾

الربع

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَّهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ﴿٥٧﴾

ترجمۂ آیات

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصّہ ملا۔ وہ گمراہی کو ترجیح دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ کھو بیٹھو! اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب واقف ہے اور اللہ کافی ہے حمایت کے لیے اور اللہ کافی ہے مدد کے لیے۔ ۴۵

یہودیوں سے ایک گروہ زبان کو توڑ موڑ کر اور دین پر طعن کرتے ہوئے الفاظ کو ان کے موقع و محل سے ہٹا دیتا ہے اور "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" "اسمع غیر مسمع" اور "راعنا" کہتا ہے اور اگر وہ "سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا" "اسمع" اور "انظرنا" کہتے تو یہ

ان کے حق میں بہتر ہوتا اور بات برمحل ہوتی لیکن اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے
ان پر لعنت کر دی ہے اس وجہ سے وہ شاذ ہی ایمان لائیں گے۔ ۴۶

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی اس چیز پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتاری ہے،
مصداق اُن پیشین گوئیوں کی جو خود تمھارے پاس موجود ہیں، قبل اس کے کہ ہم چہروں کو
بگاڑ دیں اور ان کو ان کے پیچھے کی جانب اُلٹ دیں یا ان پر بھی اسی طرح لعنت کر
دیں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کر دی اور خدا کی بات شدنی ہے۔ ۴۷

اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔ اس کے سوا جو کچھ
ہے اس کو جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے وہ ایک
بہت بڑے گناہ کا افترا کرتا ہے۔ ذرا ان کو تو دیکھو جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ ٹھہراتے
ہیں! بلکہ اللہ ہی ہے جو پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا
جائے گا۔ دیکھو، یہ اللہ پر کیسا جھوٹ باندھ رہے ہیں اور صریح گناہ ہونے کے لیے
تو یہی کافی ہے۔ ۴۸-۵۰

ذرا ان کو دیکھو جنھیں کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا۔ یہ جبت اور طاغوت پر
عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر تو
یہ ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی ہے اور جن پر اللہ لعنت کر دے تو تم ان
کا کوئی مددگار نہیں پا سکتے۔ کیا خدا کے اقتدار میں کچھ اُن کا بھی دخل ہے کہ یہ لوگوں
کو کچھ بھی دینے کو تیار نہیں؟ کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں، اس فضل پر جو اللہ نے
اُن کو بخشا؟ تو ہم نے تو بخش دی آلِ ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت اور ہم نے ان کو ایک

عظیم سلطنت بھی بخشی۔ ۵۱-۵۴

پس ان میں سے ایسے بھی ہیں جو اس پر ایمان لائے اور ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس سے منہ موڑا۔ ایسوں کے لیے جہنم کی بھڑکتی آگ ہی کافی ہے۔ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا ہم ان کو ایک سخت آگ میں جھونک دیں گے۔ جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کو دوسری کھالیں بدل دیں گے تاکہ یہ عذاب کا مزا خوب چکھیں۔ بے شک اللہ عزیز و حکیم ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اس میں ہمیشہ رہیں گے، اس میں ان کے لیے پاک بیویاں ہوں گی اور ہم ان کو گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔ ۵۵-۵۷

۲۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۝ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا (۴۴-۴۵)

قرآن اور دیگر آسمانی صحیفوں میں نسبت جزو اور کل کی ہے

اَلَمْ تَرَ کا خطاب، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں لکھ چکے ہیں، عموماً جمع اور اظہارِ تعجب و افسوس کے لیے آتا ہے۔ یہاں خطاب مسلمانوں سے ہے اور اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ سے مراد یہود ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ پچھلے آسمانی صحیفوں اور قرآن عظیم میں نسبت جزو اور کل کی ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کامل کتاب ہے، دوسرے آسمانی صحیفے اس کے اجزا و حصص کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے جو لوگ اس کتاب کامل کے اجزا و حصص کے حامل بنائے گئے تھے ان سے سب سے زیادہ توقع اس بات کی ہو سکتی تھی کہ جب یہ کتاب کامل ان کے پاس آئے گی تو وہ اس کا آگے بڑھ کر خیر مقدم کریں گے لیکن ان کا عجیب حال ہے کہ وہ اس ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کو قبول کرنا تو الگ رہا، دل و جان سے ان کی کوشش یہ ہے کہ تم بھی اس پائی ہوئی صراط مستقیم کو کھو بیٹھو۔ اوپر آیت ۲۷ میں یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اس کتاب کے ذریعے سے پچھلے انبیاء و صالحین

کے طریقوں کی طرف رہنمائی فرما رہا ہے لیکن خواہشات نفس کے پیرو یہ کوشش کر رہے ہیں کہ تم راہ حق سے بالکل ہی دور ہٹ جاؤ۔ اب یہ اسی اشارے کی تفصیلات آ رہی ہیں۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ الآیۃ۔ مسلمانوں کے لیے تسکین و تسلی کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ان دشمنوں سے بے خبر نہیں ہے۔ ان سے اور ان کی چالوں اور شرارتوں سے خوب واقف ہے، وہ ان کی ہر شرارت کو ناکام بنا دے گا۔ جس کا حامی و ناصر اللہ ہو اس کے لیے اللہ کی حمایت و نصرت کافی ہے۔ پس اپنی راہ پر آگے بڑھتے چلو اور اللہ کی کارسازی اور مدد پر بھروسہ رکھو۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۚ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴۶)

یہود کی ایک شرارت

اس آیت کے تمام الفاظ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہ ان شرارتوں کی طرف اجمالاً اشارہ ہے جو یہودی اشرار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی نگاہوں سے گرانے اور اسلام کو بے وزن اور حقیر بنانے کے لیے کرتے تھے۔

اچھے مجلسی الفاظ کا استعمال طنز کے طور پر

'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'، 'اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ'، اور 'رَاعِنَا' وغیرہ الفاظ جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، عرب کے مجلسی الفاظ میں سے تھے جو متکلم کی تحسین و قدر افزائی، سامع کے اظہار ذوق و شوق اور مخاطب کے اعتراف و قبول پر دلیل ہوتے تھے۔ جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں، بجا ارشاد ہے۔ سر تسلیم خم ہے۔ سبحان اللہ، کیا خوب بات فرمائی ہے۔ نادر نکتہ ہے۔ مکرر ارشاد ہو۔ پھر فرمائیے۔ اسی طرح عرب میں بھی مذکورہ الفاظ و کلمات رائج تھے۔ یہ الفاظ اصلاً تو اظہار تحسین یا اعتراف و قبول کے لیے ہیں لیکن اگر کوئی گروہ شرارت اور بدتمیزی کرنا چاہے تو ذرا زبان کو توڑ مروڑ کر، تلفظ کو بگاڑ کر، یا لب و لہجہ میں ذرا مصنوعی انداز پیدا کر کے بڑی آسانی سے تحسین کو تقبیح اور اعتراف و اقرار کو طنز و استہزا بنا سکتا ہے۔ اس سے متکلم کے وقار کو کوئی نقصان پہنچے یا نہ پہنچے لیکن شرارت پسند اشخاص اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔ اب ان الفاظ کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ سمجھ لیجیے۔

'سمعنا و اطعنا' کا مفہوم

'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کے لفظی معنی ہیں، ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ اہل عرب یہ اس موقع پر بولتے تھے جب اپنے کسی بڑے، کسی سردار، کسی بادشاہ کے حکم و ارشاد پر اپنی طرف سے امتثال امر کے لیے آمادگی اور مستعدی کا اظہار کرنا چاہتے۔ عربی میں اس کے لیے 'طَاعَةٌ' کا لفظ بھی ہے جو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہودی اشرار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں جاتے تو اپنی سعادت مندی اور وفاداری کی نمائش کے لیے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' تو بات بات پر کہتے لیکن لب و لہجہ کے تصرف سے اس کو ادا اس طرح کرتے کہ 'اَطَعْنَا' کو 'عَصَيْنَا' بنا لیتے۔ چونکہ دونوں کے حروف ہم آہنگ اور قریب المخرج ہیں اس وجہ سے اس تحریف

میں ان کو کامیابی ہو جاتی۔ اس طرح وہ تسلیم و اطاعت کے جملہ کو نافرمانی و سرکشی کے قالب میں ڈھال دیتے اور سمجھنے والے ان کی اس شرارت پر کوئی گرفت بھی نہ کر سکتے اس لیے کہ وہ بڑی آسانی سے یہ بہانہ بنا سکتے تھے کہ ہم نے 'سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا' کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں شریف اور خوددار آدمی بات کو سن اور سمجھ کر بھی خاموشی سے ٹال دینے ہی کو بہتر خیال کرتا ہے۔

'اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ' کا مفہوم

'اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ' کے لفظی معنی ہیں، سنو وہ بات جو پہلے سنائی نہیں گئی۔ اس فقرے کا اچھا محل یہ ہے کہ مجلس میں متکلم یا خطیب کی کوئی حکیمانہ بات سن کر ایک سامع دوسرے سامع کو متوجہ کرے کہ یہ دانشمندانہ اور حکیمانہ بات سنیے، یہ بات پہلی بار ہمارے کانوں نے سنی ہے، اس سے پہلے یہ بات کبھی ہم نے نہیں سنی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات نہ صرف متکلم اور خطیب کی قدر دانی کی دلیل ہے بلکہ دوسروں کو اس کی قدردانی کے لیے تشویق و ترغیب بھی ہے لیکن کوئی شخص ہوٹنگ (HOOTING) کے انداز میں باندازِ تمسخر یہی بات کہے تو اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ ذرا اس کی ناشنیدنی سنو، یہ کیسی بے پر کی اڑا رہا ہے، ایسی بات کا ہے کو کبھی کسی نے سنی ہوگی؟ ظاہر ہے کہ محض انداز اور لب و لہجہ کی تبدیلی نے اس نہایت اعلیٰ فقرے کو طعن و طنز کا ایک زہر آلود نشتر بنا دیا لیکن اس پر بھی کوئی گرفت نہیں ہو سکتی اس لیے کہ گرفت ہو تو کہنے والا صفائی پیش کر سکتا ہے کہ میں نے تو طنز کے طور پر نہیں بلکہ تحسین کے طور پر کہا ہے۔ چونکہ اس فقرے میں طنز کا پہلو 'غَيْرَ مُسْمَعٍ' کے الفاظ سے پیدا ہوتا تھا اس لیے قرآن نے اس کی یہ نوک توڑ دی اور ہدایت کی کہ صرف 'اِسْمَعْ' کہا جائے۔

'رَاعِنَا' کا مفہوم

'رَاعِنَا' کے لفظی معنی ہیں، ذرا ہماری رعایت فرمائیے۔ اس لفظ کا اچھا محل استعمال یہ ہے کہ اگر مخاطب نے متکلم کی بات اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ ہو یا بات ایسی لطیف اور حکیمانہ ہو کہ خود متکلم کی زبان سے اس کو مکرر سننا چاہے تو اس کو دوبارہ متوجہ کرنے کے لیے جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں، پھر ارشاد ہو، پھر فرمائیے، اسی طرح عربی میں 'رَاعِنَا' کہتے ہیں۔ یہ لفظ سامع کے ذوق و شوق اور اس کی رغبت علم کی دلیل ہے۔ لیکن یہودی اشرار 'لَیِّ لسان' یعنی زبان کے توڑ مروڑ کے ذریعہ سے اس کو بھی طنز کے قالب میں ڈھال لیتے تھے۔ اس کی شکل یہ ہوتی کہ 'رَاعِنَا' میں 'ع' کے کسرہ کو ذرا دبا دیجیے تو یہ لفظ 'رَاعِيْنَا' بن جائے گا اور اس کے معنی ہوں گے ہمارا چرواہا۔ قرآن نے یہود کی اس شرارت کی وجہ سے اس لفظ کو سرے سے مسلمانوں کے مجلسی الفاظ ہی سے خارج کر دیا اور اس کی جگہ 'اُنْظُرْنَا' کے استعمال کی ہدایت فرمائی جس کے معنی ہیں ذرا ہمیں مہلت عنایت ہو، ذرا پھر توجہ فرمائیے۔ یعنی مفہوم کے لحاظ سے یہ ٹھیک 'رَاعِنَا' کا قائم مقام ہے اور اس میں لہجہ کے بگاڑ سے کسی بگاڑ کے پیدا کیے جانے کا کوئی موقع نہیں ہے۔[1]

---

[1] اس لفظ پر آیت ۱۰۴ کے تحت سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔ وہاں ہم نے اس مجلسی اصلاح کے فوائد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ حامل کتاب گروہ ہو کر یہ جسارت اور بدتمیزی جو آخری پیغمبر کے ساتھ یہ لوگ کر رہے ہیں، یہ یونہی نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی لعنت کا نتیجہ ہے جو ان کے کفر کے سبب سے ان پر ہوئی ہے۔ خدا نے ان کو اپنے دروازے سے دھتکار دیا ہے۔ اب مشکل ہی سے ان میں سے کچھ لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب ہو گی۔

نبی پر طعن خود دین پر طعن ہے

اس آیت میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ یہود کی یہ تمام شرارتیں تھیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر طنز کی نوعیت کی لیکن قرآن نے ان کو طَعْنًا فِی الدِّیْنِ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ نبی درحقیقت مجسمۂ دین اور مظہرِ شریعت ہوتا ہے اس وجہ سے اس پر طعن خود دین پر طعن ہے۔ اس نکتے پر انشاء اللہ ہم سورۂ حدید کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓی اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (۴۷)

چہروں کو مسخ کر دینے کی علت

'طمس الشیئ' کے معنی ہیں کسی شے کے آثار و علامات کو مٹا دینا۔ چہروں کو مٹا دینے کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو آنکھ، کان، ناک اور منہ کے نشانات ہیں یہ سب مٹا کر برابر کر دیے جائیں اس لیے کہ اللہ نے یہ قوتیں نہایت اعلیٰ مقصد سے بخشی تھیں لیکن جب ان سے وہ کام نہیں لیا گیا جس کے لیے یہ عطا ہوئی تھیں بلکہ اس کے بالکل برعکس یہ سب چیزیں ٹھوکر کھانے کے گڑھے بن کر رہ گئی ہیں تو آخر یہ گڑھے کیوں باقی رکھے جائیں! یہ بھر کیوں نہ دیے جائیں؟ یہ ملحوظ رہے کہ سورۂ بقرہ میں ان لوگوں کو 'صم، بکم، عمی' کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب سب کچھ رکھتے ہوئے یہ گونگے، بہرے اور اندھے بن چکے ہیں تو یہ اسی کے سزاوار ہیں کہ یہ نشانات بھی مٹا ہی دیے جائیں۔

وُجُوهًا کے نکرہ لانے کی بلاغت

'وُجُوهًا' کی تنکیر میں بھی بڑی بلاغت ہے۔ یہ تنکیر نفرت و کراہت کے اظہار کے لیے ہے۔ اوپر والی آیت میں ان پر لعنت کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس تنکیر سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ یہ ملعون چہرے اس درجہ قابلِ نفرت ہیں کہ متکلم تعین کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ 'وُجُوْهَهُمْ' نہیں کہا بلکہ ان سے منہ پھیر کر 'وُجُوْهًا' کہا۔ اس قسم کی تنکیر اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۲۴ محمد) میں لفظ 'قُلُوْبٍ' میں بھی ہے۔ اس کی بلاغت پر ہم اس کے محل میں انشاء اللہ بحث کریں گے۔

فَنَرُدَّهَا عَلٰی اَدْبَارِهَا کا مفہوم

'فَنَرُدَّهَا عَلٰٓی اَدْبَارِهَا' اسی اوپر والی بات کی تفصیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کے چہرے اور گدی میں کوئی فرق ہی نہیں، جس طرح پیچھے کا حصہ سپاٹ ہے اسی طرح عملاً آگے کا حصہ بھی سپاٹ ہی ہے تو یہ آگے کا حصہ بھی پیچھے ہی کی طرف کیوں نہ موڑ دیا جائے۔

'اَصْحٰبَ السَّبْتِ' پر لعنت کی وجہ اور اس کے اثرات پر بقرہ کی آیات ۶۵-۶۶ کے تحت مفصل بحث گزر چکی ہے۔

یہود کو آخری دھمکی

یہ آیت یہود کے لیے دعوت کی نہیں بلکہ تہدید و وعید کی آیت ہے۔ دعوت کا ذکر اس میں محض اتمامِ حجت کے طور پر ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہ آخری موقع ہے کہ تم سنبھلنا چاہو تو سنبھل جاؤ۔ یہ موقع نکل گیا تو پھر

یہ کبھی میسر نہ آئے گا بہتر ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جو تمھاری اپنی کتاب کی پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتی ہوئی اتری ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ اب تمھارے لیے وہ وقت آ پہنچا ہے کہ تمھارے چہرے بگاڑ دیے جائیں یا تمھارے اوپر بھی اسی طرح کی لعنت کر دی جائے جس طرح کی لعنت سبت والوں پر کر دی گئی کہ وہ ذلیل بندر ہو کر رہ گئے۔

وہ لعنت جس کے یہود مستحق تھے

رحمت کی طرح لعنت اور نقمت کے بھی مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ یہاں ان کو جس درجے کی لعنت کی دھمکی دی گئی ہے یہ وہ لعنت ہے جس کے فی الواقع وہ اپنی شرارتوں کی وجہ سے مستحق بن چکے تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس سے کم درجے کی لعنت ان پر کی تو یہ ان کو گویا تھوڑی سی مہلت دی گئی اور ہر مہلت جو کسی قوم کو ملتی ہے اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتی تو یہ اس کے اخروی عذاب میں زیادتی کا باعث ہوتی ہے۔

عمل اور سزا میں مشابہت

یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ چہروں کو بگاڑ دینے کی دھمکی جو ان کو دی گئی اس میں عمل اور سزا کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اوپر والی آیت میں ان کی یہ حرکت جو بیان ہوئی ہے کہ پیغمبر کا مذاق اڑانے کے لیے منہ بنا بنا کر اور لہجے بگاڑ بگاڑ کر الفاظ کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں اور اس منہ بنانے اور الفاظ کے بگاڑنے کو انھوں نے ہنر سمجھ رکھا ہے اس کی بنا پر وہ مستحق ہوئے کہ واقعی ان کے چہرے مسخ ہی کر دیے جائیں۔ علیٰ ہذا القیاس جنھوں نے حق سے منہ موڑنے ہی کو شیوہ بنا لیا ہے تو وہ سزاوار ہیں کہ ان کے چہرے پیچھے ہی کی طرف الٹ دیے جائیں۔

'وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُولًا' میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ آدمیوں کے چہروں کو گدی کی طرح سپاٹ کر دینا، ان کو الٹ دینا یا ان کو مسخ کر کے بندروں کی شکل کا کر دینا خدا کے لیے کوئی مشکل کام ہے۔ اس کے کسی حکم اور اس کے وقوع میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ ادھر حکم ہوا ادھر اس کا نتیجہ موجود۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ۝ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝ انْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُبِينًا ۝ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ۝ أُولٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۖ وَمَنْ يَلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا (۴۸-۵۲)

جبت اور 'طاغوت' کا مفہوم

'جبت' سے مراد اعمال سفلیہ، مثلاً سحر، شعبدہ، ٹونے ٹوٹکے، رمل جفر، فال گیری، نجوم، آگ پر چلنا۔ اور اس قسم کی دوسری خرافات ہیں۔ ہاتھ کی لکیروں کا علم بھی اسی میں شامل ہے۔

سورۂ بقرہ کی تفسیر میں آیات ۲۸۶-۲۸۸ کے تحت ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ یہود اپنے دور زوال میں کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال کر بس انھی چیزوں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے انبیا نے نہایت درد انگیز الفاظ میں ان کی اس حالت پر نوحہ کیا ہے۔ اس سے متعلق ضروری حوالے وہاں نقل ہوئے ہیں۔ یہاں اعادے میں طوالت ہوگی۔

'طاغوت' پر تفصیلی بحث بقرہ کی آیت ۲۵۶ کے تحت گزر چکی ہے۔

دین کی بنیاد توحید پر ہے

دین کی بنیاد توحید پر ہے۔ یہ صرف عقیدوں میں سے ایک عقیدہ ہی نہیں ہے بلکہ سارے دین کے قیام و بقا کا انحصار اسی پر ہے۔ جو لوگ ہر پہلو سے اس کی حفاظت کرتے ہیں وہی اپنی دوسری کوتاہیوں کے باوجود اپنے اصل دین کی حفاظت کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جو لوگ توحید میں رخنہ پیدا کر دیتے ہیں وہ اصل دین کو ہدم کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے دوسرے کام بھی، جو بظاہر دینداری کے ہوں، بالکل بے سود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا لیکن دوسرے گناہوں کو جن کے لیے چاہے گا معاف فرما دے گا۔ "جن کے لیے چاہے گا" کی قید اس بات کی دلیل ہے کہ دوسرے گناہوں کے معاملے میں بھی کسی کو دلیر نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ ان کی معافی بھی اللہ ہی کی مشیت پر منحصر ہے۔ اس کی مشیت میں نہ تو کسی دوسرے کو کوئی دخل ہے، نہ اس کی کوئی مشیت حکمت سے خالی ہے۔ علاوہ ازیں گناہوں کے معاملے میں یہ دلیری اور ڈھٹائی بجائے خود بھی شرک کی ایک قسم ہے۔

شرک کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا

یہ تمہید اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے بیان ہوئی ہے کہ یہود جو لعنت کے مستحق قرار پاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حامل کتاب ہوتے ہوئے انھوں نے دین کی جو بنیاد ہے وہی اکھاڑ دی ہے اور اس کی جگہ انھوں نے شرک کو اختیار کر لیا ہے۔ 'شرک' اللہ پر ایک افترائے عظیم ہے جس کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف فرمانے والا نہیں ہے۔ شرک کو افترا کہنے کی وجہ ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ شرک کرنے والے اپنی تمام مشرکانہ حرکات کو دین کی سند دینے کے لیے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان باتوں کا حکم ان کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ پر صریح تہمت ہے اور اگر کوئی گروہ جو اللہ کے دین کی گواہی دینے پر مامور ہو، وہ خدا پر تہمت باندھنے کا پیشہ اختیار کر لے تو وہ لعنت کے سوا اور کس چیز کا مستحق ہو سکتا ہے!

اس تمہید کے بعد یہاں ان کے تین قسم کے شرک گنائے ہیں۔

یہود کے شرکانہ اعمال و عقائد

ایک یہ کہ یہ اپنے آپ کو ایک برتر اور برگزیدہ گروہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اللہ کے محبوبوں کی اولاد اور خود خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں اس وجہ سے ان کے لیے خدا کے ہاں کوئی بازپرس یا سزا نہیں ہے۔ ان کے اعمال و اخلاق خواہ کچھ ہوں، اول تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے، اگر ڈالے بھی گئے تو محض تھوڑی مدت کے لیے۔ اس گھمنڈ نے ان کو عمل اور اطاعت کی ذمہ داریوں سے بالکل فارغ کر دیا ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو بندگی کے دائرے سے نکال کر الوہیت کے زمرے میں داخل کر لیا ہے حالانکہ کہیں بھی اللہ نے ان کو برگزیدگی کی یہ سند عطا نہیں فرمائی ہے۔ جس کسی کو بزرگی عطا ہوتی ہے وہ خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا نے اس چیز کو ایمان و عمل اور نیکی و تقویٰ سے وابستہ کیا ہے نہ کہ نسل و نسب سے۔ ہر شخص جو کرے گا وہ بھرے گا۔ اللہ ان کے ساتھ ذرہ برابر بھی ناانصافی کرنے والا نہیں۔ اپنی برتری کا یہ عقیدہ جو انھوں نے گھڑا ہے، یہ ان کا اپنا طبع زاد ہے۔ اس کو خدا سے جو وہ منسوب کرتے ہیں تو یہ خدا

پر جھوٹا افترا ہے اور ان کے مجرم ہونے کے لیے، دوسرے جرائم سے قطع نظر، یہی جرم کافی ہے۔

اعمالِ سفلیہ اور ارواحِ خبیثہ

دوسرا یہ کہ حامل کتاب ہوتے ہوئے یہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے اور اعمالِ سفلیہ کے قائل اور ان پر عامل ہیں۔ اعمالِ سفلیہ کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کا تعلق بیشتر شیطانی قوتوں اور ارواحِ خبیثہ سے ہوتا ہے، انھی کو یہاں طاغوت کہا گیا ہے۔ جو لوگ ان اعمال کے درپے ہوتے ہیں اوّل تو وہ ارواحِ خبیثہ کو بالذات موثر مانتے ہیں پھر ان سے تعلق پیدا کرنے اور ان کو اپنے مقاصد میں استعمال کرنے کے لیے ان کو نہ صرف خلافِ شرع بلکہ صریح مشرکانہ اعمال کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے جس سے عقیدہ اور عمل دونوں یکقلم تباہ ہو کے رہ جاتے ہیں۔ تفسیر سورۂ بقرہ میں اس پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

تیسرا یہ کہ یہ لوگ اہلِ ایمان کے مقابل میں کفار و مشرکین کی حمایت کرتے اور ان کو مسلمانوں سے بڑھ کر حق و ہدایت پر سمجھتے ہیں۔ یہ بات سورۂ بقرہ اور آلِ عمران میں بھی گزر چکی ہے۔

اہلِ ایمان کے بالمقابل مشرکین کی حمایت

یہود اسلام کی مخالفت میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ کھلم کھلا مشرکینِ مکہ کو مسلمانوں پر ترجیح دیتے تھے اور اپنی اس مخالفت کے لیے آڑ اسلام کی ان تعلیمات اور رخصتوں کو بناتے تھے جو ان کی بدعات یا ان کی شریعت کے تشددات کے خلاف تھیں۔ مثلاً حدث اور جنابت کی حالت میں، اسلام نے پانی میسر نہ آنے کی صورت میں، تیمم کی اجازت دی تو اس کو بھی انھوں نے فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ بھلا جو مذہب جنابت کی حالت میں زمین پر ہاتھ مار کر نماز تک پڑھ لینے کی اجازت دیتا ہو وہ بھی کوئی خدائی مذہب ہو سکتا ہے، ان سے زیادہ اچھا مذہب تو ان بت پرستوں کا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ طہارت کے باب میں یہود کے فقہا نے اتنے تشددات پیدا کر لیے تھے کہ آدمی حالتِ جنابت میں بالکل ہی اچھوت بن کے رہ جاتا تھا۔ جنابت تو در کنار انجیل سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہودی فقہا حضرت مسیح کے صحابہ پر اس بات کے لیے بھی معترض ہوتے تھے کہ یہ لوگ بعض اوقات ہاتھ دھوئے بغیر ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔ سیدنا مسیح نے ان کی اسی طرح کی خردہ گیریوں پر ان کو سفیدی پھری ہوئی قبروں سے تشبیہ دی تھی کہ جس طرح قبروں کے اوپر سفیدی پھری ہوئی ہوتی ہے لیکن اندر سڑی گلی ہوئی ہڈیاں ہوتی ہیں اسی طرح یہ لوگ اوپر سے تو بڑے اُجلے اور صاف معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر لوٹ کا مال بھرا ہوا ہے۔ یہود کی یہی ذہنیت مسلمانوں کے خلاف نمایاں ہوئی۔ وہ مشرکین تک کو گوارا کرنے کے لیے تیار تھے نہیں تیار تھے تو مسلمانوں کو گوارا کرنے کے لیے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح حق کی حمایت حق پرستی ہے اسی طرح شرک کی حمایت شرک پرستی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جن پر اللہ لعنت کر دے ان کا کوئی مددگار ان کے کچھ کام نہیں آ سکتا۔ جس پر خدا کی لعنت ہو جائے خدا کے ہاں سے اس کی جڑ کٹ جاتی ہے اور جس درخت کی جڑ کٹ جائے اسے کوئی لاکھ پانی دے اس کا ہرا ہونا ممکن نہیں۔

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۙ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (۵۳-۵۴)

'ملک' سے مراد یہاں خدائی اقتدار و اختیار ہے اور 'الناس' سے مراد یہاں مسلمان ہیں۔

یہود بنی اسمٰعیل کے حاسد تھے

مطلب یہ ہے کہ کیا خدا کے اقتدار و اختیار میں کچھ ان کی بھی حصہ داری ہے کہ اس کے فضل و انعام میں سے یہ جس کو چاہیں حصہ دیں، جس کو چاہیں محروم کر دیں، چنانچہ اپنے اسی اختیار کی بنا پر وہ مسلمانوں کو خدا کے فضل و کرم سے محروم رکھنا چاہتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے — اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے — تو پھر اس تمام بوالفضولی سے کیا حاصل؟ تقدیر الٰہی سے پنجہ آزمائی کر کے کون جیتا ہے جو یہ جیت سکیں گے!

اس کے بعد اصل راز سے پردہ اٹھا دیا ہے کہ یہ سارا طوفان اس حسد کا نتیجہ ہے جو یہ مسلمانوں سے رکھتے ہیں۔ ان کو یہ غم و غصہ ہے کہ نبوت تو ان کے خاندان کا حصہ تھی، یہ ان کے خاندان سے نکل کر بنی اسمٰعیل کے اندر کس طرح چلی گئی؟ انھیں خبر نہیں ہے کہ نبوت اور شریعت اللہ کا فضل ہے، اللہ جس کو چاہے اپنا فضل بخشے۔ اللہ کے بخشے ہوئے فضل پر حسد کرنا اور اس حسد کے بحران میں مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہونا خود اللہ سے لڑنے کے مرادف ہے۔ اگر یہ اللہ سے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو لڑیں، ہم نے تو آل ابراہیم کو کتاب و حکمت بھی بخش دی اور ان کو ایک عظیم سلطنت بھی بخش دی۔ یعنی جو کچھ انھیں کرنا ہے کر لیں، ہم نے تو جو کچھ کرنا تھا کر دیا۔

زبان کا ایک اسلوب

'فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الاية' شرطیہ اور انشائیہ جملوں میں جب اس طرح 'فقد' آتا ہے تو اس سے پہلے کلام میں کچھ حذف ہوتا ہے جس کی تفصیل بعد کے جملہ سے ہوتی ہے۔ یہاں مدعا یہ ہے کہ اگر بنی اسمٰعیل پر حسد کی وجہ سے یہ لوگ اس نبی کی مخالفت کر رہے ہیں تو جتنا حسد کرنا ہے کر لیں، ہم نے تو آلِ ابراہیم کو کتاب و حکمت بھی بخش دی اور ایک عظیم بادشاہی بھی۔

آل ابراہیم سے مراد بنی اسمٰعیل ہیں

'آلِ ابراہیم' اگرچہ عام ہے لیکن یہاں مراد بنی اسمٰعیل ہیں۔ قرینہ اس پر دلیل ہے۔ اس لیے کہ یہ بات بنی اسرائیل کو بطور سرزنش کہی جا رہی ہے۔ اس وجہ سے وہ اس میں شامل نہیں ہو سکتے اور جب وہ شامل نہیں ہو سکتے تو اس کے واحد مصداق صرف بنی اسمٰعیل رہ جاتے ہیں۔ پھر یہاں کتاب و حکمت اور خلافت کے عطا کیے جانے کا ذکر ہے اور یہ عطا کیا جانا بنی اسرائیل پر لعنت کے بعد ہے اس وجہ سے ان کے اس میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں تورات سے خود ثابت ہے کہ یہود نے اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کے بجائے ہمیشہ حضرت اسحٰقؑ ہی سے منسوب کیا۔ تورات میں ہے کہ "ابراہیمؑ کی اولاد اسحٰقؑ کے نام سے پکاری جائے گی۔" اس کے برعکس اہل عرب اپنے آپ کو ہمیشہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرتے رہے، اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ نے وہیں قیام کیا، وہیں بیت اللہ کی تعمیر فرمائی اور وہیں اپنے تمام مناسک ادا کیے۔

اس اسلوب بیان سے ایک تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل یہ نہ خیال کریں کہ آل ابراہیم ہونے کا شرف انھی کو حاصل ہے۔ یہ شرف بنی اسمٰعیل کو بھی حاصل ہے۔ دوسری یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو اس نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا تھا اور جو صریحاً حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد ہی سے متعلق تھا۔ تورات میں یہ وعدہ یوں مذکور ہے۔

"اور خداوند کے فرشتے نے آسمان سے دوبارہ ابراہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند کر دوں گا اور تیری اولاد دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی" کتاب پیدائش باب ۲۲

تورات کے اس بیان سے صاف واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدۂ برکت حضرت ابراہیمؑ سے اس وقت فرمایا ہے جب انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے — حضرت اسمٰعیلؑ — کی قربانی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس وجہ سے لازماً یہ وعدہ حضرت اسمٰعیلؑ اور انھی کی نسل سے متعلق ہو سکتا ہے۔

بنی اسمٰعیل کے لیے اللہ تعالیٰ کے تین وعدے

اس وعدے میں تین باتوں کا ذکر ہے۔

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو ایک عظیم امت بنائے گا۔

دوسری یہ کہ ان کو عظیم فتوحات حاصل ہوں گی اور دشمنوں کے پھاٹکوں پر ان کا قبضہ ہوگا۔

تیسری یہ کہ اس نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی۔

یہ تینوں وعدے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پورے ہوئے۔ آپ کی بعثت سے ایک عظیم امت ظہور میں آئی، یہ امت دشمنوں کے پھاٹکوں کی مالک بنی، اور آپ کی دعوت سے تمام عالم انسانی کو دین و شریعت کی برکت نصیب ہوئی۔

وعدے کا بمنزلۂ واقعہ

اسی وعدے کا عملی ظہور ہے جس کی طرف آیت زیر بحث میں اشارہ ہے۔ اگرچہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے اس وقت تک یہ وعدہ مکمل طور پر ظاہر نہیں ہوا تھا لیکن اس کے پورے ہونے کے لیے فیصلۂ الٰہی صادر ہو چکا تھا اس وجہ سے اس کو تعبیر اس طرح فرمایا ہے کہ گویا یہ عملاً پورا ہو چکا ہے۔

اس اسلوب بیان کی قرآن مجید میں متعدد مثالیں ہیں۔ ہم ایک مثال یہاں پیش کرتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا	اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ	میری قوم کے لوگو، اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد
اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ	کرو کہ اس نے تم ہی میں انبیا اٹھائے، تمھیں بادشاہ بنایا
مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰقَوْمِ	اور تمھیں وہ کچھ بخشا جو دنیا والوں میں سے کسی کو نہیں

ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ	بخشا۔ اے میری قوم کے لوگو، اس ارض مقدس میں داخل
اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ	ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور پیچھے نہ
فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ (۲۰-۲۱ مائدہ)	پلٹو کہ نامراد ہو جاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ تقریر قوم کے سامنے اس وقت فرمائی ہے جب وہ اس کو ارض مقدس پر حملہ کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ظہور میں نہیں آئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ان باتوں کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس نے حضرت موسیٰ کو اس فیصلے سے آگاہ بھی فرما دیا تھا اس وجہ سے حضرت موسیٰ نے ان کا ذکر اس طرح فرمایا ہے گویا یہ وعدے پورے ہو چکے ہیں۔

حکومت کتاب وحکمت کے ثمرات میں سے ہے

اس آیت سے ایک لطیف نکتہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سلطنت وخلافت کتاب وحکمت کے ثمرات ونتائج میں سے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو کتاب وحکمت کی نعمت عطا فرماتا ہے اور وہ قوم سچی شکر گزاری کے ساتھ اس کو قبول بھی کر لیتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو امامت وخلافت کا منصب بھی سونپ دیا گیا۔ یہ مضمون بیان تو قرآن مجید میں کئی جگہ ہوا ہے لیکن یہاں خاص اہتمام سے بیان ہوا ہے۔ جو لوگ عربی زبان کا ذوق رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں اٰتَیْنَا کے فعل کے اعادے میں بڑی بلاغت ہے۔ یہود کا سارا حسد تو اسی وجہ سے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ اس قرآن کے ساتھ اس زمین کی بادشاہی بھی بندھی ہوئی ہے چنانچہ ان کے اسی حسد پر کاری ضرب لگانے کے لیے فرمایا کہ ہم نے نہ صرف کتاب وحکمت ان کو دی بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک عظیم سلطنت بھی ان کو دی۔ تمہارے حسد کے علی الرغم!

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِیْرًا ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۝ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۭ لَهُمْ فِیْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِیْلًا (۵۵-۵۷)

بنی اسمٰعیل کو تنبیہ

یہ آیات بنی اسمٰعیل سے متعلق ہیں۔ فرمایا کہ ان میں سے ایک گروہ تو اس کتاب وحکمت کو قبول کر کے ایمان سے مشرف ہو چکا ہے لیکن ایک گروہ ابھی اس سے روگرداں ہے۔ اس گروہ کے متعلق فرمایا کہ اگر یہ اپنے کفر پر اڑا رہا تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ میں داخل کرے گا جہاں ان کے عذاب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی، ان کو دوسری کھالیں پہنا دی جائیں گی تاکہ ان کا عذاب تازہ ہوتا رہے۔ اللہ عزیز یعنی غالب ہے کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ حکیم ہے یعنی اس کا کوئی فعل عدل وحکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

دوسرا گروہ جو ایمان لایا ان کے متعلق فرمایا کہ ان کو ہم جنت میں داخل کریں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اس میں ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ ان تمام اجزا کی تشریح سورۂ بقرہ میں ہو چکی ہے۔

قرآن نے جہاں کہیں بنی اسمٰعیل پر اپنے اس احسان عظیم کا ذکر فرمایا ہے وہاں اس امر کی وضاحت ضرور فرما دی ہے کہ اس احسان کا تعلق ایمان و اسلام سے ہے۔ مجرد خاندان و نسب سے نہیں ہے۔ بنی اسمٰعیل میں سے بھی وہی لوگ اس انعام الٰہی میں حصہ دار ہیں جو اس قرآن اور اس نبی پر ایمان لاتے ہیں، جو ایمان نہیں لائے وہ سب دوزخ میں جائیں گے، اسرائیلی ہوں یا اسمٰعیلی۔ سورۂ جمعہ میں فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا	وہی خدا ہے جس نے اُمّیوں (بنی اسمٰعیل) میں انہی میں
مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	سے ایک رسول اٹھایا جو سناتا ہے ان کو اس کی
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ	آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت
لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ	کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے کھلی
لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ	گمراہی میں تھے ــــ اور ان دوسروں میں بھی جو ابھی تک
الْحَكِيْمُ ۝ (۲-۳ جمعہ)	ان سے ملے نہیں ہیں اور اللہ عزیز و حکیم ہے۔

یہاں بھی آخری ٹکڑے میں کفار قریش کی طرف اشارہ ہے جو ابھی تک اس نعمت کو قبول کرنے والوں میں شامل نہیں ہوئے تھے اور الفاظ کچھ تنبیہ کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ یہ تنبیہ اسی لیے ہے کہ بنی اسمٰعیل اس حقیقت سے آگاہ رہیں کہ اللہ نے بہت بڑا فضل ان پر فرمایا ہے لیکن یہ فضل انہی لوگوں کے لیے ہے جو اس کی قدر کریں، جو اس کی قدر نہ کریں گے ان کو یہ مجرد اس بنیاد پر حاصل نہیں ہو جائے گا کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہیں۔ چونکہ یہود اسی طرح کی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم ہوئے تھے اس وجہ سے پہلے ہی مرحلے میں قرآن نے یہ آگاہی بنی اسمٰعیل کو سنا دی۔

۲۲- آگے کا مضمون ــــ آیات ۵۸-۷۰

آگے مسلمانوں کو خطاب کر کے پہلے ان کو یہ نصیحت کی گئی ہے کہ شریعت الٰہی کی یہ امانت یہود سے چھین کر اب تمہارے حوالہ ہو رہی جا رہی ہے تو تم یہود کی طرح قومی اور گروہی تعصب کی بیماری میں مبتلا نہ ہو جانا بلکہ ہمیشہ حق و انصاف کو نگاہ میں رکھنا۔ اب تم کتاب و حکمت کے ساتھ ایک ملک عظیم کے وارث بھی بنائے جا رہے ہو اور تم پر لوگوں کے معاملات کی ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے تو تم لوگوں کے حقوق ادا کرنا اور ہمیشہ اپنے فیصلوں میں عدل کو ملحوظ رکھنا اور اس بات کو یاد رکھنا کہ جس خدا نے تم کو اس ذمہ داری پر مامور کیا ہے وہ سمیع و بصیر ہے۔

اس کے بعد وہ طریقہ بتایا ہے جس کو اختیار کر کے مسلمان بحیثیت امت مسلمہ کے منظم و مستحکم، حق و عدل پر استوار اور اختلاف و نزاع سے ابھرنے والی آفتوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ یہ گویا ان اساسات کی تفصیل ہے جن پر اسلامی نظام حکومت مبنی ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی طرف توجہ فرمائی ہے جو مسلمانوں میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن ان کی وفاداری ابھی تقسیم تھی، وہ پوری طرح اللہ و رسول اور امامت کے اولوا الامر کی اطاعت پر ابھی مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ چونکہ امامت کی وحدت اور اسلامی حکومت کے اندر اصلی رخنہ انہی کی طرف سے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اس وجہ سے ان کی طرف تفصیل کے ساتھ توجہ فرمائی۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۸-۷۰

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا ۙ وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿۵۸﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَإِنْ تَنٰزَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿۵۹﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ اٰمَنُوا بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوٓا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوٓا أَنْ يَكْفُرُوا بِهٖ ۖ وَيُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيدًا ﴿۶۰﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنٰفِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا ﴿۶۱﴾ فَكَيْفَ إِذَآ أَصٰبَتْهُمْ مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ ۖ بِاللّٰهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسٰنًا وَتَوْفِيقًا ﴿۶۲﴾ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِيٓ أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿۶۳﴾ وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَلَوْ

ع ۹ ۵

أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ جَآءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ
لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ﴿٦٤﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا
يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِىٓ أَنفُسِهِمْ
حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾ وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ
أَنِ اقْتُلُوٓا أَنفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوا مِن دِيَارِكُم مَّا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ
مِّنْهُمْ ۖ وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَشَدَّ
تَثْبِيتًا ﴿٦٦﴾ وَإِذًا لَّاٰتَيْنٰهُم مِّن لَّدُنَّآ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٦٧﴾ وَلَهَدَيْنٰهُمْ
صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴿٦٨﴾ وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ
الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَآءِ
وَالصّٰلِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيقًا ﴿٦٩﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۚ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيمًا ﴿٧٠﴾ ع ۹ ۱۱

ترجمہ آیات ۵۸۔۷۰

اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو۔ اور جب لوگوں
کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ خوب بات ہے یہ جس کی اللہ تمہیں
نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ۵۸

اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولوالامر
کی۔ پس اگر کسی امر میں اختلاف رائے واقع ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ،
اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ طریقہ بہتر اور باعتبار مآل اچھا ہے۔ ۵۹

ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں

جو تم پر اتاری گئی ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے لیکن چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات فیصلے کے لیے طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انھیں اس کے انکار کا حکم دیا گیا ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ انھیں نہایت دور کی گمراہی میں ڈال دے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور رسول کی طرف آؤ تو تم منافقین کو دیکھتے ہو کہ تم سے کترا جاتے ہیں۔ اس وقت کیا ہوگا جب ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو کوئی مصیبت پہنچے گی، پھر یہ تمھارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ خدا کی قسم ہم نے تو صرف بہتری اور سازگاری چاہی۔ ان لوگوں کے دلوں کے اندر جو کچھ ہے اللہ اس سے خوب واقف ہے تو ان سے اعراض کرو، ان کو سمجھاؤ اور ان سے خود ان کے باب میں دل میں دھنسنے والی بات کہو۔ ۶۰-۶۳

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اور اگر وہ، جب کہ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا، تمھاری خدمت میں حاضر ہوتے اور خدا سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی چاہتا تو وہ خدا کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔ پس نہیں، تیرے رب کی قسم، یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک اپنی نزاعات میں تمھی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دیں۔ اور اگر ہم ان پر یہ فرض کرتے کہ اپنے آپ کو قتل کر دو یا اپنے گھروں کو چھوڑ دو تو ان میں سے بس تھوڑے ہی اس کی تعمیل کرتے اور اگر یہ لوگ وہ کرتے جس کی ہدایت کی جاتی تو ان کے لیے یہ بات بہتر اور ایمان پر قدم جمانے والی ہوتی۔ اس وقت ہم انھیں اپنے پاس سے بڑا اجر دیتے اور انھیں

صراط مستقیم کی ہدایت بخشتے۔ ۶۴-۶۸

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے وہی ہیں جو انبیاء، صدیقین اور شہدا و صالحین کے اس گروہ کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا فضل فرمایا اور کیا ہی اچھے ہیں یہ رفیق! یہ اللہ کی طرف سے فضل ہے اور اللہ کا علم کفایت کرتا ہے۔ ۶۹-۷۰

۲۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا (۵۸)

امانت کا لفظ اپنے وسیع مفہوم میں

'امانت' کا لفظ یہاں اپنے محدود مفہوم میں نہیں ہے بلکہ جس طرح 'إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، الایۃ' (ہم نے امانت کو پیش کیا آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر) والی آیت میں یہ آیا ہے اسی طرح یہاں بھی نہایت وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ تمام حقوق و فرائض، خواہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہوں یا حقوق العباد سے، انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے، اپنوں سے متعلق ہوں یا بیگانوں سے، مالی معاملات کی قسم سے ہوں یا سیاسی معاہدات کی قسم کے، صلح و امن کے دور کے ہوں یا جنگ کے۔ غرض جس نوعیت اور جس درجے کے حقوق و فرائض ہوں وہ سب امانت کے مفہوم میں داخل ہیں اور مسلمانوں کو شریعت اور اقتدار کی امانت سپرد کرنے کے بعد اجتماعی حیثیت سے سب سے پہلے جو ہدایت ہوئی وہ یہ ہے کہ تم جن حقوق و فرائض کے ذمہ دار بنائے جا رہے ہو ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔

امانت کا حق

اگر اس سورہ کے پچھلے مطالب ذہن میں محفوظ ہیں تو یہ بات سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہو سکتی کہ اس ہدایت کے اندر یہ تلمیح بھی مضمر ہے کہ یہ امانت جن سے چھین کر تمھیں دی جا رہی ہے انھوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا۔ جس منصب شہادت پر ان کو مامور کیا گیا اس کو انھوں نے چھپایا، جو کتاب ان کی تحویل میں دی گئی اس میں انھوں نے تحریف کی، جس شریعت کا ان کو حامل بنایا گیا اس میں انھوں میں اختلاف پیدا کیا، جن حقوق کے وہ امین بنائے گئے ان میں اُنھوں نے خیانت کی، جو فرائض اُن کے سپرد ہوئے ان میں وہ چور ثابت ہوئے، جو عہد انھوں نے باندھے وہ سب توڑ ڈالے۔ اس وجہ سے تمھاری اولین ذمہ داری یہ ہے کہ اس عظیم امانت کی صورت میں جن حقوق و فرائض کے اب تم حامل بنائے جا رہے ہو ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔

حقوق و فرائض کے لیے امانت کا لفظ ایک تو یہ تصور پیدا کرتا ہے کہ یہ سب خدا کی سپرد کردہ امانتیں ہیں اس لیے کہ ان کا عائد کرنے والا خدا ہی ہے۔ دوسرا یہ کہ ان ساری امانتوں سے متعلق ایک دن لازماً امانت سونپنے والے کی طرف سے پرسش ہونی ہے، اگر ان میں کوئی خیانت ہوگی تو کوئی نہیں ہے جو خدا کی پکڑ سے بچا سکے۔

امانت کا سب سے اہم پہلو

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ الاٰیۃ یہ امانت کے سب سے اہم پہلو کی تفصیل بھی ہے اور اقتدار کے ساتھ جو ذمہ داری وابستہ ہے اس کی وضاحت بھی۔ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں اقتدار بخشتا ہے ان پر اولین ذمہ داری جو عاید ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے جھگڑوں کو عدل و انصاف کے ساتھ چکائیں۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں امیر و غریب، شریف و وضیع، کالے اور گورے کا کوئی فرق نہ ہو، انصاف خریدنی و فروختنی چیز نہ بننے پائے، اس میں کسی جنبہ داری، کسی عصبیت، کسی سہل انگاری کو راہ نہ مل سکے۔ کسی دباؤ، کسی زور و اثر اور کسی خوف و طمع کو اس پر اثر انداز ہونے کا موقع نہ ملے۔

جن کو بھی اللہ تعالیٰ اس زمین میں اقتدار بخشتا ہے، اسی عدل کے لیے بخشتا ہے۔ اس وجہ سے سب سے بڑی ذمہ داری اسی چیز کے لیے ہے۔ خدا کے ہاں عادل حکمران کا اجر بھی بہت بڑا ہے اور غیر عادل کی سزا بھی بہت سخت ہے۔ اس وجہ سے تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ بہت ہی اعلیٰ نصیحت ہے جو اللہ تعالیٰ تمھیں کر رہا ہے اس میں کوتاہی نہ ہو۔ آخر میں اپنی صفات سمیع و بصیر کا حوالہ دیا ہے کہ یاد رکھو کہ خدا سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے، کوئی مخفی سے مخفی ناانصافی بھی اس سے مخفی رہنے والی نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۵۹)

'اولوالامر' سے مراد

اولوالامر سے مراد اسلامی معاشرے کے ارباب حل و عقد، ذمہ دار اور سربراہ کار ہیں۔ معاشرے کے حالات کے لحاظ سے اس کے مصداق ارباب علم و بصیرت بھی ہو سکتے ہیں اور ارباب اقتدار و سیاست بھی۔ جو لوگ بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ عوام کی سربراہی کر سکیں وہ اس لفظ کے مصداق ہیں۔ اگر امام و خلیفہ موجود ہو تو وہ اور اس کے حکام اولوالامر ہیں اور اگر یہ موجود نہ ہوں تو جماعت کے اندر جو معاملہ فہم اور صاحب بصیرت ہوں وہ اس سے مراد ہوں گے۔ اسی سورہ میں ایک اور مقام میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ	اور جب ان کو امن یا خطرے کی کوئی خبر ملتی ہے اس کو
اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى	لے اڑتے ہیں حالانکہ اگر وہ اس کو رسول اور اپنے اولوالامر
اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ	کے سامنے پیش کرتے تو جو لوگ بات کی تہ کو پہنچنے والے
مِنْهُمْ (۸۳- نساء)	ہیں وہ صورت معاملہ کو سمجھ لیتے۔

اولوالامر کی امتیازی خصوصیت

جس زمانہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اس زمانے میں ظاہر ہے کہ نہ ابھی خلافت کا وجود تھا نہ باضابطہ امرا و حکام تھے۔ اس وجہ سے اولوالامر سے مراد صحابہؓ میں سے وہ لوگ ہوں گے جو دینی و اجتماعی معاملات کی گہری سوجھ بوجھ رکھنے والے اور لوگوں کے مرجع اعتماد تھے۔ یہاں 'استنباط' کا لفظ اولوالامر کی امتیازی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اسلام میں مذہبی و سیاسی قیادت کا منصب اصلاً انھیں لوگوں کے لیے ہے جو بصیرت و اجتہاد کی صلاحیت کے مالک ہیں۔ طبقے، برادری، خاندان اور جائداد وغیرہ کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

تاویل کا مفہوم

'تاویل' کے لفظ پر سورۂ آل عمران کی آیت ۷ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ آل، یؤول اولاً و مآلاً کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف لوٹنا، رجوع کرنا۔ اسی سے تاویل کا لفظ ہے جس کے معنی بات کو اس کے اصل مآل و مرجع کی طرف لوٹانے کے ہیں۔ اسی مفہوم سے یہ خواب کی تعبیر، کسی بات کی حقیقت اور کسی کلام کی تفسیر و توضیح کے لیے استعمال ہونے لگا اس لیے کہ ان صورتوں میں بھی بات اپنے اصل مآل اور مدعا کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔ آیت زیر بحث میں 'اَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا' کا مطلب یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں اللہ و رسول کی بات کی طرف رجوع کرنا حقیقت رسی اور مآل کار دونوں اعتبار سے بہتر ہے۔ خدا ہی کا علم تمام علم و حقیقت کا مرجع بھی ہے اور اسی کی ذات سب کا ملجا و ماویٰ بھی، اور اسی کو حقیقی حاکمیت بھی حاصل ہے۔

اسلام میں امر و طاعت کے تین مرکز

ہر اجتماعی و سیاسی نظام کی تشکیل امر اور طاعت سے ہوتی ہے۔ اسلام میں امر و طاعت کے مرکز تین ہیں۔ اللہ، رسول، اولوالامر۔ ان میں سے دو سابق الذکر مستقل اور بالذات مرکز اطاعت ہیں۔ اس وجہ سے ان کے ساتھ 'اَطِیۡعُوۡا' کا فعل مستقلاً استعمال ہوا۔ اولوالامر کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت کے تحت ہے اس وجہ سے ان کے لیے 'اطیعوا' کا فعل الگ نہیں استعمال ہوا بلکہ اس کو صرف سابق پر عطف کر دیا ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اولوالامر صرف اللہ و رسول کے احکام کی تنفیذ کا ذریعہ ہیں اس وجہ سے ان کی اطاعت خدا اور رسول کے احکام کے خلاف جائز نہیں ہے۔[1]

اختلاف رائے کی صورت میں کتاب اللہ اور سنت کی مراجعت کی ہدایت

فان تنازعتم فی شیء۔ تنازع فی الشیء، تنازع فی الحدیث، تنازع فی الامر' کے معنی، جیسا کہ ہم سورۂ آل عمران کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، اختلاف رائے کے آتے ہیں یعنی کسی معاملے میں کسی کی رائے کچھ ہو، کسی کی کچھ۔ موقع دلیل ہے کہ یہاں اس سے مراد وہ اختلاف رائے ہے جو کسی معاملے میں حکم شریعت معین کرنے کے باب میں ہو سکتا ہے۔ مثلاً کسی نص شرعی کی تعبیر و تاویل میں اختلاف رائے ہو جائے۔ یا کسی امر اجتہادی میں اختلاف پیدا ہو جائے۔ یہ اختلاف قرآن کی کسی آیت یا رسول کی کسی سنت کی تاویل میں بھی ہو سکتا ہے اور غیر منصوص معاملات میں کتاب و سنت سے اوفق کے تعین میں بھی۔ علیٰ ہذا القیاس

---

[1] یہ ملحوظ رہے کہ اللہ و رسول کے احکام کے خلاف کسی کے حکم کی اطاعت جائز نہیں ہے لیکن امراء و حکام کے معاملے میں شریعت کے اس حکم کے ساتھ کچھ تفصیلات بھی بیان ہوئی ہیں جن کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ ہم نے اس مسئلہ پر اپنی کتاب "اسلامی ریاست" کے باب 'اطاعت کے حدود و شرائط' میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

یہ اولوالامر اور عوام کے درمیان بھی ہو سکتا ہے اور خود اولوالامر کے اندر آپس میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح کا جب کوئی اختلاف واقع ہو تو اس کے حل کے لیے امت کو یہ ہدایت ہوئی کہ اس معاملے کو اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ۔ "اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کتاب و سنت کے نصوص میں اس معاملے کے لیے کوئی قطعی رہنمائی موجود نہیں ہے تو قرآن کے اشارات، مقتضیات، فحویٰ اور امثال و نظائر کو پیش نظر رکھ کر اس میں اوفق بالکتٰب والسنۃ کا تعین کرو اور اس کو اختیار کر لو۔ فرمایا کہ یہ طریقہ تاویل کے پہلو سے سب سے زیادہ بہتر اور اعلیٰ ہے۔ اس لیے کہ ظن غالب یہی ہے کہ یہ بات اللہ و رسول کی بات کے موافق ہوگی اور اختلاف کا فیصلہ اس قانون کے مطابق ہوگا جو اسلام میں اصل قانون اور تمام فقہ و اجتہاد کا مرکز و مرجع ہے اور یہی طریقہ ہے نظامِ اجتماعی و سیاسی میں حاکمیتِ الٰہی کے پوری مضبوطی کے ساتھ پکڑنے اور اعتصام بحبل اللہ کا اور یہی حقیقی توحید ہے۔

اجماع رفع اختلاف کا منصوص طریقہ ہے

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ یہ ہدایت امت کو بحیثیت امت دی گئی ہے۔ اس طرح کی ہدایات میں خطاب اگرچہ عام ہوتا ہے لیکن ان کی عملی تنفیذ کی ذمہ داری امت کے اربابِ حل و عقد یا قرآن کے الفاظ میں اولوالامر ہی پر عاید ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یہ انھی کی ذمہ داری ہے کہ اگر کسی امر میں اختلاف رائے واقع ہو تو وہ اصل قانون شریعت یعنی کتاب و سنت کی طرف رجوع کریں اور جو بات اس سے اوفق نظر آئے اس کو اختیار کریں۔ اربابِ حل و عقد یا ان کی اکثریت کا صاحبِ امر یعنی خلیفہ اور امام کی رہنمائی میں، کسی امر کے اوفق بالشریعت ہونے پر اتفاق کر لینا شریعت میں اجماع کہلاتا ہے جو رفع اختلاف کے لیے ایک منصوص طریقہ ہے اور اس کی مخالفت کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔[1]

کتاب، سنت اور اجتہاد

'رد الی اللہ والرسول' کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی امر میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہو تو پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں نہ ملے تو نبی کی سنت کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں بھی نہ ملے تو پھر اس کے معلوم کرنے کا راستہ اجتہاد ہے۔ اجتہاد کے آداب و شرائط جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابہؓ کے تعامل سے معلوم ہوتے ہیں، وہ اصولِ فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں اور ایسے فطری اور عقلی ہیں کہ کسی معقول آدمی کے لیے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔[2]

کتاب اللہ کی طرح سنت کی حیثیت بھی دائمی ہے

اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ قانون اسلامی کے مرجع کی حیثیت سے کتاب اللہ کی طرح سنت رسول کی حیثیت بھی مستقل اور دائمی ہے۔ اس لیے کہ فرمایا ہے کہ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (پس اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ) ظاہر ہے کہ یہ ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک ہی تک کے لیے محدود نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اس اختلاف کے پیدا ہونے کا غالب امکان تو حضورؐ کی وفات کے بعد ہی تھا

---

[1] اجماع پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب 'اسلامی قانون کی تدوین' میں کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

[2] ہم نے اپنی کتاب 'اسلامی قانون کی تدوین' میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

اور آیت خود شہادت دے رہی ہے کہ اس کا تعلق مستقبل ہی سے ہے۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد آپ کی سنت ہی ہے جو آپ کے قائم مقام ہو سکتی ہے۔ یہ تسلیم کرنے کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وقت کے اولوالامر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام ہو سکتے ہیں اس لیے کہ یہاں اولوالامر کو حذف کر دیا ہے جو اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ اولوالامر قانون کے مرجع کی حیثیت سے دین میں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے۔ مستقل حیثیت صرف اللہ اور رسول کی ہے اور رسول کی بھی اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے قانون کی تعلیم و تبیین پر مامور فرمایا اور اس منصب کی ذمہ داریاں ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کے لیے اسے غلطی اور گناہ سے محفوظ کیا۔ گویا اصل حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، رسول صرف اللہ کے احکام اور اس کی مرضیات کے بتانے کا ایک معصوم ذریعہ ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا ۝ فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا (۶۰-۶۳)

'تحاکم الی الحاکم' کے معنی ہیں 'تخاصم الیہ' یعنی اپنا قضیہ اور معاملہ حاکم کے سامنے پیش کیا۔

تحاکم الی الطاغوت ایمان کے منافی ہے

'طاغوت' کی تحقیق سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے مقابل میں فرمایا ہے تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہاں 'طاغوت'، کتاب اللہ اور رسول کی ضد کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ مدینہ اور اطراف مدینہ میں آیت کے زمانۂ نزول تک یہ حیثیت صرف یہود کے سرداروں اور لیڈروں ہی کو حاصل تھی کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے بچنا چاہتے، وہ اپنے معاملات ان کے پاس لے جاتے اس وجہ سے طاغوت سے مراد وہی ہو سکتے ہیں اور ہر اعتبار سے وہ اس لفظ کے بالکل ٹھیک مصداق تھے۔

یہ بانداز تعجب منافقین کا ذکر ہو رہا ہے (اور قرائن سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ منافقین اہل کتاب میں سے آئے ہوئے لوگ تھے) جو دعویٰ تو یہ کرتے تھے کہ وہ قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور پچھلے صحیفوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن اپنے معاملات میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کے بجائے یہود کے سرداروں اور ان کی عدالتوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ حالانکہ جس اللہ و رسول پر وہ ایمان کے مدعی تھے ان کی طرف سے یہ واضح ہدایت اتر چکی ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان کے لیے لازم ہے کہ طاغوت کا انکار کیا جائے، بغیر اس انکار کے ایمان معتبر نہیں۔ لیکن یہ دونوں کو جمع کرنا چاہتے تھے اور شیطان یہ چاہتا ہے کہ اس طرح ان کو بھٹکا کر صراط مستقیم سے اتنی دور کر دے کہ پھر ان کے لیے اس کو پانے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہ جائے۔

منافقین کو دھمکی

فرمایا کہ آج تو جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اپنے معاملات اللہ اور رسول ہی کے سامنے پیش کرو، ایمان کا یہی تقاضا ہے، تو کسی نہ کسی بہانے سے کترا جاتے ہیں لیکن اس وقت کیا ہوگا جب ان کی ان شرارتوں کی پاداش میں ان پر ایسا وقت آجائے گا کہ یہ بھاگے ہوئے تمہارے پاس آئیں گے اور قسمیں کھا کھا کے یقین دلائیں گے کہ جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں کسی بری نیت سے نہیں کرتے رہے ہیں بلکہ بھلائی اور سازگاری کی نیت سے کرتے رہے ہیں۔

منافقین کا طرز عمل

جس مصیبت کے پیش آنے کا یہاں ذکر ہے وہ بعد میں اس طرح پیش آئی کہ جب اسلام نے طاقت پکڑلی اور یہود کی سیاسی طاقت بالکل کمزور ہوگئی تو مسلمانوں کو یہ ہدایت کردی گئی کہ اب منافقین کے معاملے میں چشم پوشی اور اغماض کی روش وہ بدل دیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنی روش بدل لی اور قدم قدم پر منافقین کا احتساب شروع کردیا۔ منافقین اس صورتِ حال سے بہت پریشان ہوئے۔ نہ یہود میں اتنا دم خم باقی رہا تھا کہ ان کی سرپرستی کرسکیں، نہ مسلمان اب ان کے چکموں میں آنے کے لیے تیار تھے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین بھاگ بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے اور قسمیں کھا کھا کے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ وہ یہود سے جو ربط ضبط اب تک رکھتے اور کبھی کبھی اپنے معاملات میں ان کی بالاتری تسلیم کرتے رہے ہیں اس میں کسی فساد نیت کو دخل نہیں تھا بلکہ ان کی خواہش صرف یہ رہی ہے کہ اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا اور جو خلیج اختلاف و عناد یہود اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہوگئی ہے وہ زیادہ وسیع نہ ہونے پائے گی۔ اس طرح وہ اپنی منافقت کو مصالحت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے اور اس کو احسان اور توفیق کے خوب صورت الفاظ سے تعبیر کرتے لیکن واقعات کے تشت ازبام ہوجانے کے بعد اس سخن سازی کا موقع بالکل نکل چکا تھا چنانچہ آگے اس سورہ میں بھی اور پھر تفصیل کے ساتھ سورۂ برأت میں منافقین کے چہرے کی یہ نقاب نوچ کر پھینک دی گئی اور ان کے لیے منہ چھپانا ناممکن ہوگیا۔

ایک سیاسی نکتہ

اس سے یہ بات نکلی کہ حریف طاقتوں کے ساتھ اختلاف یا رواداری کی پالیسی بنانا امت کے ارباب حل وعقد اور اس کے سربراہوں کا کام ہے، نہ کہ عوام کی کسی ٹولی کا۔ اگر ارباب حل وعقد کسی حریف طاقت سے برسر جنگ ہیں اور عوام کے اندر کے کچھ افراد ان کی طرف محبت واعتماد کی پینگیں بڑھائیں اور اس کو امت کی خیر خواہی اور باہمی سازگاری کی کوشش کا نام دیں تو یہ صریح بدخواہی اور کھلی ہوئی منافقت ہے۔

منافقین کے دل کا اصل راز

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے، یہ امت کی خیر خواہی اور سازگاری پیدا کرنے کا جذبہ ہے جو ان سے یہ پاپڑ بلوا رہا ہے یا منافقت اور طاغوت پرستی کا فساد ہے جو انھیں اسلام کی طرف ابھی یکسو ہونے نہیں دے رہا ہے اور یہ دل میں اس امید کی پرورش کر رہے ہیں کہ شاید اس کشمکش کا نتیجہ یہود اور کفار کی فتحمندی کی شکل میں نکلے تو ان کی یہ منافقت کی پالیسی کامیاب رہے گی۔ فرمایا کہ ان کی اس حرکت سے اعراض کرو، ان کو نیک و بد اچھی طرح سمجھا دو، اور ان کے حق میں جو کچھ بہتر ہے اس سے

ایسے انداز میں ان کو آگاہ کر دو کہ ان کے کان کھلیں اور بات، دلوں میں اترے ہیں۔

فَکَیْفَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ الایۃ میں جو دھمکی ہے وہ فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ وَعِظْھُمْ وَقُلْ لَّھُمْ فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَوْلًاۢ بَلِیْغًا میں اور زیادہ تیز و تند ہو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اپنی اس منافقت کے لیے جو سازش کر رہے ہیں، خدا اس کی حقیقت سے خوب واقف ہے، اس وجہ سے تم معاملہ خدا کے حوالہ کرو اور ابھی ان سے اعراض کرو، البتہ ان کو نیک و بد اچھی طرح سمجھا دو کہ جو کھیل یہ کھیل رہے ہیں یہ خود ان کے لیے مستقبل میں نہایت خطرناک ثابت ہوگا۔ وعظ کے لفظ کے متعلق ہم کہیں یہ لکھ آئے ہیں کہ عربی میں یہ لفظ زجر اور تنبیہ کے مفہوم کا بھی حامل ہے۔

قَوْلًا بَلِیْغًا کی بلاغت

وَقُلْ لَّھُمْ فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَوْلًاۢ بَلِیْغًا میں فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ کے الفاظ اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ ان پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ یہ نصیحت خود ان کے حق میں بہتر ہے، ان کی اس روش سے اسلام کو کوئی ضرر پہنچنے والا نہیں ہے، اللہ اپنے دین کی حفاظت کے لیے کافی ہے، البتہ یہ خود اپنے آپ کو تباہ کر لیں گے۔ قَوْلًا بَلِیْغًا کے الفاظ اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ اب نصیحت کا انداز کان کھولنے والا اور دل میں دھنسنے والا ہونا چاہیے، یہ بہرے اور بلید لوگ ہیں اس وجہ سے کریمانہ انداز نصیحت ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ آپ اگر کسی کی غلطی پر کوئی گرفت فرماتے تو کمال رحم و رافت و شفقت کی وجہ سے نہایت ہی نرم اور کریمانہ انداز میں اس کی طرف اشارہ فرماتے۔ اگرچہ حضورؐ کے شایانِ شان انداز یہی تھا اور ذی صلاحیت لوگوں کے لیے یہ اشارہ کافی بھی ہو جاتا تھا لیکن منافقین اس کریم النفسی کے نااہل تھے نہ قدردان، بلکہ وہ اس سے غلط فائدہ اٹھاتے اور روز بروز اپنی شرارتوں میں دلیر ہوتے جا رہے تھے۔ اس وجہ سے یہ ہدایت ہوئی کہ اب ان کے ساتھ زیادہ نرمی برتنے کا موقع نہیں ہے بلکہ وقت آ گیا ہے کہ ان کو واضح الفاظ میں تنبیہ کی جائے اور ان کے نیک و بد سے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیا جائے تاکہ یہ سنبھلنا چاہیں تو تباہی کے گڑھے میں گرنے سے پہلے پہلے سنبھل جائیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ۭ وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ جَاۗءُوْکَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰہَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ۝ فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۶۴-۶۵)

رسول کا اصلی مرتبہ

اب یہ رسول کا صحیح مرتبہ واضح فرمایا کہ رسول صرف مان لینے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ وہ اس لیے آتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ وہ صرف عقیدت ہی کا مرکز نہیں بلکہ اطاعت کا مرکز بھی ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت صرف ایک واعظ و ناصح ہی کی نہیں بلکہ ایک واجب الاطاعت ہادی کی بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اذن کے تحت اس کو اس لیے مامور فرماتا ہے کہ لوگ جملہ معاملات میں اس کے احکام کی اطاعت کریں اس لیے کہ اس کی اطاعت ہی بالواسطہ خدا کی اطاعت ہے۔ جو لوگ رسول کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس کے

سیاسی اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے یا اس سے اپنے آپ کو آزاد رکھنا چاہتے ہیں ان کا دعوائے ایمان جھوٹا ہے۔

یہاں "باذن اللہ" کی قید اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ اصل حاکمیت اللہ ہی کی ہے لیکن وہ اپنے اذن سے اپنے رسول کو یہ منصب بخشتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس کے امر و نہی سے آگاہ فرمائے اور اس مقصد کے لیے وہ اس کو غلطی اور خطا سے محفوظ فرماتا ہے اس وجہ سے رسول، خدا کی قانونی و تشریعی حاکمیت کا مظہر ہوتا ہے اور اس پر ایمان اور ساتھ ہی اس کی بے چون و چرا اطاعت خدا پر ایمان اور خدا کی اطاعت کے ہم معنی بن جاتی ہے۔

رسول خدا کی تشریعی حاکمیت کا مظہر ہے

ظاہر ہے کہ جب رسول، خدا کی حاکمیتِ قانونی و تشریعی کا مظہر ہے تو اس امر کی کوئی گنجائش کسی صاحبِ ایمان کے لیے باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ رسول کی عدالت کو چھوڑ کر اپنے کسی معاملے کو فیصلہ کے لیے طاغوت کی عدالت میں لے جائے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر بہت بڑا ظلم ڈھاتا ہے اس لیے کہ فی الحقیقت یہ چیز خدا کی حاکمیت کا انکار اور بالواسطہ شرک اور کفر کا ارتکاب ہے۔ چنانچہ ان منافقین سے متعلق، جو اپنے معاملات یہود کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، فرمایا کہ جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ان کے لیے اس کی اصلاح اور اس کے عواقب سے نجات کی واحد شکل یہ تھی کہ وہ رسول کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کرتے، خدا سے مغفرت کے طالب ہوتے اور رسول بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کے ذریعہ سے ان کی سفارش کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتا اور ان پر رحم فرماتا۔ اس کے سوا اس کی تلافی کی کوئی اور شکل نہیں۔

ایمان کی بنیادی شرط رسول کی اطاعت ظاہراً و باطناً

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے درمیان پیدا ہونے والی تمام نزاعات میں تمھی کو حکم نہ مانیں اور پھر ساتھ ہی ان کے اندر یہ ذہنی تبدیلی نہ واقع ہو جائے کہ وہ تمھارے فیصلے کو بے چون و چرا پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ مانیں اور اپنے آپ کو بلا کسی استثنا و تحفظ کے تمھارے حوالے کر دیں۔ رسول کی اطاعت خود خدا کی اطاعت کے ہم معنی ہے اس وجہ سے اس کا حق صرف ظاہری اطاعت سے ادا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے دل کی اطاعت بھی شرط ہے۔

یہاں 'فَلَا وَرَبِّكَ' کی قسم کا موقع و محل بھی ملحوظ رہے۔ اس سے صرف رسول کی ظاہری و باطنی اطاعت کی تاکید ہی مقصود نہیں ہے بلکہ یہ منافقین کی جھوٹی قسم کی جو آیت ۶۲ میں مذکور ہے، سچی قسم کے ساتھ تردید بھی ہے۔ پھر 'وَرَبِّكَ' کے خطاب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے التفاتِ خاص کی جو دل نوازی ہے اس کی بلاغتوں کا اندازہ تو صرف اہلِ ذوق ہی کر سکتے ہیں، قلم ان کی تعبیر سے قاصر ہے۔

رسول کا استغفار بمنزلۂ شفاعت ہے

'فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ' میں ان کے لیے رسول کے استغفار کی جو شرط لگائی گئی ہے اس میں دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ رسول کا یہ استغفار ان کے لیے اس دنیا میں بمنزلۂ شفاعت ہے جس سے

ان کے اس گناہ عظیم کے بخشے جانے کی توقع ہے، دوسرا یہ کہ رسول کی عدالت کے ہوتے ان کا "تحاکم الی الطاغوت" رسول کی صریح توہین ہے اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ وہ رسول کی رضا اور ان کی دعا بھی حاصل کریں۔ منافقین سوچتے تو ان کو رسول کی برکتوں سے متمتع ہونے کا بڑا موقع حاصل تھا لیکن ان میں سے بہتوں نے اس موقع کی قدر نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بعد میں محروم کر دیا۔ سورۂ منافقون میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ۝ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (۵-۶)	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کا رسول تمہارے لیے اللہ سے مغفرت مانگے گا تو وہ اپنی گردنیں موڑ لیتے ہیں اور تم ان کو گھمنڈ کے ساتھ اعراض کرتے دیکھتے ہو، ان کے لیے برابر ہے، تم ان کے لیے مغفرت مانگو یا نہ مانگو، اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے، اللہ نافرمانوں کو بامراد کرنے والا نہیں ہے۔

وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيتًا ۝ وَإِذًا لَآتَيْنَاهُمْ مِنْ لَدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا ۝ وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ۝ ذَٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ عَلِيمًا (۶۶-۷۰)

منافقین کی بنیادی کمزوری

اب یہ ان منافقین کے اصل سبب نفاق سے پردہ اٹھایا ہے کہ یہ بننے کو تو اسلام کے مدعی بن بیٹھے ہیں لیکن ابھی یہ جاہلیت کے سابق روابط و تعلقات کے پھندوں سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ ابھی تک خاندان، برادری، قبیلہ اور قوم کی زنجیریں بھی ان کے پاؤں میں ہیں اور وطن اور سرزمین کی وابستگیاں بھی دامن گیر ہیں اس وجہ سے یہ آگے بڑھنے کی بجائے بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہیں حالانکہ اسلام کا اول مطالبہ یہی ہے کہ آدمی ہر زنجیر کو توڑ کر صرف اللہ کے لیے اُٹھ کھڑا ہو جس طرح مہاجرین اولین اُٹھ کھڑے ہوئے۔

حق کی دوستی کا اصل تقاضا

یہ ملحوظ رہے کہ یہ منافقین زیادہ تر یہود اور اطراف مدینہ کے قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ یہ اسلام کی اُبھرتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر اسلام کے اظہار پر تو مجبور ہو گئے تھے لیکن جیسا کہ اُوپر گزرا یہ اپنے روابط یہود اور اپنے قبائلی سرداروں کے ساتھ بھی رکھنا چاہتے تھے اور اسی غرض کے لیے اپنے معاملات و مقدمات میں بھی ان سے رجوع کرتے تھے۔ قرآن نے یہ ان کی اسی کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان کو اپنوں سے لڑنے اور اپنے گھر بار چھوڑ کر مسلمانوں کے ساتھ آملنے کا حکم دیا جائے تو اس جہاد

اور ہجرت کے لیے ان میں سے بہت تھوڑے آمادہ ہوں گے۔ اُقتلوا انفسکم کے مفہوم پر ہم بقرہ آیت ۵۴ اور نساء آیت ۲۹ کے تحت جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ جہاد اول تو اپنی فطرت ہی سے ایک سخت آزمائش ہے لیکن جب یہ تلوار ان کے خلاف اٹھانی پڑے جن سے خون اور قرابت کے رشتے ہوں اور جن کی حمیت و حمایت کا جذبہ رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئے ہو تو یہ آزمائش سخت تر ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس صورت میں تلوار گویا اپنی ہی گردنوں پر چلانی پڑتی ہے۔ لیکن اسلام حق کے مقابل میں خون اور نسب کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس وجہ سے خدا کی وفاداری کا امتحان پاس کرنے کے لیے اہل ایمان کو اس مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ بدر کے موقع پر ماموں کی تلوار بھانجے کے اور بھتیجے کی تلوار چچا کے مقابل میں بے نیام ہوئی اور عصبیت جاہلیت کے تمام روابط حق کے آگے بالکل بے حقیقت ہو کے رہ گئے۔

اسلام کی اسی حقیقت کی طرف یہاں ان منافقین کو بھی توجہ دلائی جا رہی ہے کہ اگر یہ بھی اپنے خاندان و قبیلہ اور گھر در کی وابستگیوں سے آزاد اور یکسو ہو کر کلیتہً مسلمانوں کے معاشرے میں شامل ہو جائیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے اور اسلام پر ان کے قدم جمانے میں یہ چیز نہایت کارگر ہوگی۔ فاسد ماحول سے نکل کر جب یہ پاکیزہ ماحول میں پہنچ جائیں گے تو ان کی کمزوریاں دور ہوں گی اور یہ بھی اسلام کے جاں نثاروں کے ساتھ مل کر خدا کے وفادار اور حق کے خدمت گزار بن جائیں گے۔

ہجرت اور جہاد کی برکات

اس کے بعد ان کی حوصلہ افزائی کے لیے فرمایا کہ یہ نہ خیال کریں کہ یہ کوئی تباہی و خودکشی کا راستہ ہے۔ اگر وہ اللہ کے لیے اپنے گھر در چھوڑ دیں گے تو اللہ ان کو خاص اپنے پاس سے اجر عظیم دے گا اور ان کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب کرے گا۔ جو لوگ سب سے کٹ کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کو اللہ کے انعام یافتہ بندوں — انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین — کی معیت و رفاقت حاصل ہوتی ہے اور کیا ہی خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو اس پاک گروہ کی معیت و رفاقت حاصل ہو! یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ اس فضل خاص کے مستحق بندوں سے بے خبر نہیں ہے۔ جو لوگ اس فضل کے حاصل کرنے کے لیے ہجرت اور جہاد کی بازیاں کھیلیں گے وہ مطمئن رہیں کہ اللہ ان کی جاں بازیوں سے اچھی طرح باخبر ہے۔

۲۴۔ آگے کا مضمون —— آیات ۷۱-۷۶

وہی اوپر والا مضمون آگے چل رہا ہے۔ خطاب اگرچہ عام مسلمانوں سے ہے لیکن تبصرہ انہی منافقین کے رویے پر ہے جن کی بابت اوپر فرمایا ہے کہ یہ اسلام کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن اس راہ میں کوئی چوٹ کھانے اور ہجرت و جہاد کی آزمائشوں سے گزرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

پہلے مسلمانوں کو جہاد کے لیے لیس ہونے اور جنگ کے لیے اٹھنے کا حکم دیا۔ فرمایا کہ اگر جماعتی حیثیت سے جنگ کے لیے اٹھنے کی ضرورت پیش آئے تو جماعتی شکل میں اٹھو اور اگر ٹکڑیوں اور دستوں کی شکل میں نکلنے کا موقع ہو تو ٹکڑیوں اور دستوں کی صورت میں نکلو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ اس کے بعد منافقین کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ خود بزدل ہیں اور دوسروں کو بھی بزدل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تم کو کوئی گزند پہنچ جائے تو خوش ہوتے ہیں کہ خوب ہوا کہ اس فوج یا دستے میں ہم شامل نہیں ہوئے اور اگر تمھیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو حاسدانہ یہ کہتے ہیں کہ کاش ہم بھی اس فوج یا دستے میں شامل ہوتے کہ اس کے حاصل کردہ مالِ غنیمت میں حصہ دار بن سکتے۔

اس کے بعد جہاد پر ابھارنے کے لیے اس کے اجرِ عظیم کا بھی ذکر فرمایا اور ساتھ ہی نہایت موثر الفاظ میں اس ضرورت کی طرف بھی توجہ دلائی جو اس وقت اس کی داعی تھی۔ وہ ضرورت یہ تھی کہ جگہ جگہ مسلمان مرد، عورتیں اور بچے کفار کے نرغے میں گھرے ہوئے، اسلام لانے کے جرم میں، ان کے ہاتھوں طرح طرح کے مظالم کا ہدف بنے ہوئے تھے اور ان کے پنجۂ ستم سے نجات حاصل کرنے کے لیے فریادیں کر رہے تھے۔ اس ظلم و ستم سے ان کو نجات دلانا ایک عظیم انسانی و اسلامی فریضہ تھا۔

پھر مسلمانوں کے جہاد اور کفار کی جنگ کے فرق کو واضح فرمایا کہ مسلمانوں کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے اور کفار کی جنگ شیطان کی راہ میں ہے۔ شیطان خواہ کتنی ہی چالیں چلے لیکن خدا کے مقابل میں اس کی ہر چال بودی ثابت ہو کے رہے گی۔ آخری کامیابی بہرحال انہی لوگوں کو حاصل ہوگی جو اللہ کے دین کا ساتھ دینے کے لیے اٹھیں گے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۱-۷۶

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا

عَظِيمًا ﴿۷۴﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ﴿۷۵﴾ الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ﴿۷۶﴾

ع ۱۰

ترجمۂ آیات ۷۱-۷۶

اے ایمان والو، اپنے اسلحہ سنبھالو اور جہاد کے لیے نکلو، ٹکڑیوں کی صورت میں یا جماعتی شکل میں۔ اور تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، پس اگر تم کو کوئی گزند پہنچ جائے تو کہتے ہیں کہ مجھ پر اللہ نے فضل کیا کہ میں ان کے ساتھ شریک نہ ہوا اور اگر تمھیں اللہ کا کوئی فضل حاصل ہو تو، اس طرح کہ گویا تمھارے اور ان کے درمیان کوئی رشتہ محبت ہے ہی نہیں، کہتے ہیں کہ اے کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا کہ ایک بڑی کامیابی حاصل کرتا۔ پس چاہیے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے وہ لوگ اٹھیں جو دنیا کی زندگی آخرت کے لیے بیچ چکے ہیں اور جو اللہ کی راہ میں جنگ کرے گا تو خواہ مارا جائے یا غالب ہو ہم اس کو اجر عظیم دیں گے۔ ۷۱-۷۴

اور تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے جنگ نہیں کرتے جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس ظالم باشندوں کی بستی سے نکال اور ہمارے لیے اپنے پاس سے ہمدرد پیدا کر اور ہمارے لیے

اپنے پاس سے مددگار کھڑے کر۔ ۷۵،،

جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جنھوں نے کفر کیا وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں تو تم شیطان کے حامیوں سے لڑو، شیطان کی چال تو بالکل بودی ہوتی ہے۔''

۲۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ خُذُوا۟ حِذْرَكُمْ فَٱنفِرُوا۟ ثُبَاتٍ أَوِ ٱنفِرُوا۟ جَمِيعًا ۝ وَإِنَّ مِنكُمْ لَمَن لَّيُبَطِّئَنَّ فَإِنْ أَصَٰبَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَالَ قَدْ أَنْعَمَ ٱللَّهُ عَلَىَّ إِذْ لَمْ أَكُن مَّعَهُمْ شَهِيدًا ۝ وَلَئِنْ أَصَٰبَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ ٱللَّهِ لَيَقُولَنَّ كَأَن لَّمْ تَكُنۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُۥ مَوَدَّةٌ يَٰلَيْتَنِى كُنتُ مَعَهُمْ فَأَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا (۷۱-۷۳)

لفظ حذر کی تحقیق

'حذر' کے اصل معنی کسی خطرہ اور آفت سے بچنے کے ہیں۔ اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ ان چیزوں کے لیے استعمال ہوا جو جنگ میں دشمن کے حملوں سے بچنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً زرہ بکتر، سپر، خود وغیرہ۔ اس کا خاص استعمال تو دفاعی آلات ہی کے لیے ہے لیکن اپنے عام استعمال میں یہ ان اسلحہ پر بھی بولا جاتا ہے جو حملے کے کام آتے ہیں۔ مثلاً تیر، تفنگ، تلوار وغیرہ۔ یہاں یہ لفظ اپنے عام مفہوم ہی میں معلوم ہوتا ہے۔ اس پر مزید بحث اسی سورہ کی آیت ۱۰۲ کے تحت آرہی ہے۔ وہاں اس کے عام اور خاص دونوں استعمالات کو قرآن نے خود واضح کر دیا ہے۔

'ثبات' کا مفہوم

'ثبات'، 'ثبۃ' کی جمع ہے۔ 'ثبۃ' کے معنی سواروں کی جماعت، ٹکڑی اور دستے کے ہیں۔

عرب میں جنگ کے دو طریقے معروف تھے۔ ایک منظم فوج کی شکل میں لشکر آرائی، دوسرا وہ طریقہ جو گوریلا جنگ (GUERRILLA WARFARE) میں اختیار کیا جاتا ہے یعنی ٹکڑیوں اور دستوں کی صورت میں دشمن پر چھاپہ مارنا۔ یہاں 'ثبات' کے لفظ سے اسی طریقے کی طرف اشارہ ہے۔ مسلمانوں نے یہ دونوں طریقے استعمال کیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظم فوج کشی بھی فرمائی اور وقتاً فوقتاً سریے بھی بھیجے۔

'بطأ یبطئ' کا مفہوم

'بطأ یبطئ' کے معنی ڈھیلے پڑنے، سست پڑنے اور پیچھے رہ جانے کے بھی ہیں اور دوسروں کو سست کرنے کے بھی۔ لسان العرب میں ہے 'بطأ فلان بفلان اذا ثبطه' فلاں نے فلاں کو سست اور پست ہمت کر دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ 'من بطأ به عمله لم يسرع به نسبه' (جس کا عمل اس کو پیچھے کر دے گا اس کا نسب اس کو آگے نہ بڑھا سکے گا)

یہ مسلمانوں کو من حیث الجماعت خطاب کر کے مسلح ہونے اور جنگ کے لیے اٹھنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا کہ اگر دستوں اور ٹولیوں کی صورت میں دشمن پر چھاپے مارنے کی نوبت آئے تو اس کے لیے بھی نکلو، اور اگر منظم ہو کر جماعتی شکل میں فوج کشی کی ضرورت پیش آئے تو اس سے بھی دریغ نہ کرو۔

منافقین کی بزدلی اور مسلمانوں کی کامیابی پر ان کا حسد

پھر فرمایا کہ تم میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو جنگ سے خود بھی جی چراتے ہیں اور دوسروں کو بھی پست ہمت کرتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تمھیں کسی مہم میں کوئی گزند پہنچ جائے تو خوش ہوتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں خوب بچایا کہ ہم اس مہم میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے اور اگر تمھیں کامیابی حاصل ہوتی ہے تو حاسدانہ کہتے ہیں کہ کاش ہم بھی اس میں شامل ہوتے تاکہ خوب مال غنیمت حاصل کر سکتے۔ اس دوسری بات کے ساتھ کَاَنْ لَّمْ تَکُنْۢ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَهٗ مَوَدَّۃٌ کے الفاظ اس بات کے کہنے والوں کے باطن پر عکس ڈال رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی شامتِ اعمال سے کسی مہم میں شامل نہیں ہوتے تو ایمانی و اسلامی اخوت کا کم از کم تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی پر خوش ہوں کہ اللہ نے ان کے دینی بھائیوں کو سرخرو کیا لیکن انھیں اس بات کی کوئی خوشی نہیں ہوتی بلکہ جس طرح حریف کی کسی کامیابی پر آدمی کا دل جلتا ہے کہ وہ اس میں حصہ دار نہ ہو سکا اسی طرح یہ لوگ اس کو اپنی کامیابی نہیں بلکہ حریف کی کامیابی سمجھتے ہیں اور اپنی محرومی پر سر پیٹتے ہیں۔ گویا اسلام اور مسلمانوں سے ان کا کوئی رشتہ ہی نہیں۔

فَلْیُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ وَمَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیُقْتَلْ اَوْ یَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا (۷۴)

'شریٰ یشری' کا مفہوم

'الَّذِیْنَ' یہاں مفعول کے محل میں نہیں بلکہ فاعل کی حیثیت میں ہے اور 'شریٰ یشری' یہاں بیچنے کے معنی میں ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَۃٍ وَكَانُوْا فِیْهِ مِنَ الزّٰهِدِیْنَ (اور انھوں نے یوسف کو نہایت حقیر قیمت پر بیچ دیا، گنتی کے چند درہموں پر، اور وہ اس کی قدر سے ناآشنا تھے) دُنیا کی زندگی کو آخرت سے بیچتے ہیں یعنی دنیا کی زندگی پر آخرت کو ترجیح دیتے ہیں۔

خدا کی راہ میں جہاد کے سزاوار کون ہیں؟

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین تو صرف اس جنگ کے غازی بننا چاہتے ہیں جس میں نکسیر بھی نہ پھوٹے اور مالِ غنیمت بھی بھرپور ہاتھ آئے۔ خدا کے دین کو ایسے نام نہاد غازیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کی راہ میں جہاد کے لیے وہ اٹھیں جو آخرت کے لیے اپنی دُنیا بیچ چکے ہوں۔ جو لوگ دُنیا کو تج کر صرف آخرت کی کامیابی کے لیے جہاد کریں گے وہ مارے جائیں یا فتحمند ہوں، دونوں ہی صورتوں میں ان کے لیے اجرِ عظیم ہے۔ رہے یہ لوگ جو صرف اس وقت تک کے لیے مجنوں بنے ہیں جب تک لیلیٰ کی طرف سے ان کو دودھ کا پیالہ ملتا ہے، خونِ جگر کا مطالبہ نہ ہو، تو ایسے مجنوں یہاں درکار نہیں ہیں۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا (۷۵)

'وَمَا لَكُمْ (تمھیں کیا ہوا ہے)' کا اسلوب کسی کام پر ابھارنے اور شوق دلانے کے لیے ہے۔ 'مُسْتَضْعَف' سے مراد مظلوم، مجبور اور بے بس کے ہیں۔ 'مُسْتَضْعَفِیْن' کا عطف 'فی سبیل اللہ' پر اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جو لوگ دین کی وجہ سے ستائے جا رہے ہوں ان کی آزادی کے لیے جنگ، قتال

فِی سَبِیۡلِ اللّٰہِ' میں سب سے اوّل درجہ رکھتی ہے۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ اسلامی جہاد کا اصلی مقصد دنیا سے فتنہ (PERSECUTION) کو مٹانا ہے۔ 'قریہ' کو یہاں صرف مکہ کے لیے خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ان آیات کے نزول کے زمانے میں مکہ کے علاوہ اور بھی بستیاں تھیں جن میں بہت سے مرد، عورتیں اور بچے مسلمان ہو چکے تھے اور وہ اپنے کافر سرپرستوں یا اپنے قبیلے کے کافر زبردستوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ 'مِنۡ لَّدُنۡكَ' کا موقع استعمال اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ظاہر حالات تو بالکل خلاف ہیں، کسی طرف سے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی لیکن اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اپنی عنایت سے کوئی راہ کھول دے تو کچھ بعید نہیں۔

جہاد کے لیے ایک اہم محرک

مطلب یہ ہے کہ تم ان مردوں، عورتوں اور بچوں کو کفار کے ظلم وستم سے نجات دلانے کے لیے کیوں نہیں اُٹھتے جو کفار کے اندر بےبسی کی حالت میں گھرے ہوئے اور ان سے چھوٹ کر مسلمانوں سے آملنے کی کوئی راہ نہیں پا رہے ہیں؟ جن کا حال یہ ہے کہ رات دن نہایت بےقراری کے ساتھ یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے پروردگار ہمیں ان ظالم باشندوں کی بستی سے نکال اور غیب سے ہمارے ہمدرد پیدا کر اور غیب سے ہمارے مددگار کھڑے کر۔

آیت کے اشارات

اس آیت سے کئی باتیں ظاہر ہو رہی ہیں۔

ایک یہ کہ ظالم کفار نے کمزور مسلمانوں پر خود ان کے وطن کی زمین اس طرح تنگ کر دی تھی کہ وہ وطن ان کو کاٹے کھا رہا تھا اور باوجودیکہ وطن کی محبت ایک فطری چیز ہے لیکن وہ اس سے اس قدر بیزار تھے کہ اس کو ظالم باشندوں کی بستی کہتے ہیں اس کی طرف کسی قسم کا انتساب اپنے لیے گوارا کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

دوسری یہ کہ کوئی وطن اسی وقت تک اہلِ ایمان کے لیے وطن کی حیثیت رکھتا ہے جب تک اس کے اندر ان کے دین و ایمان کے لیے امن ہو۔ اگر دین و ایمان کو اس میں امن حاصل نہ ہو تو وہ وطن نہیں بلکہ وہ خونخوار درندوں کا بھٹ، سانپوں اور اژدہوں کا مسکن اور شیطانوں کا مرکز ہے۔

تیسری یہ کہ اس زمانے میں حالات اس قدر مایوس کن تھے کہ مظلوم مسلمانوں کو ظاہر میں نجات کی کوئی راہ بھی سجھائی نہیں دے رہی تھی، سارا بھروسہ بس اللہ کی مدد پر تھا کہ وہی غیب سے ان کے لیے کوئی راہ کھولے تو کھولے۔ اس کے باوجود یہ مسلمان اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ اللہ اکبر! کیا شان تھی ان کی استقامت کی! پہاڑ بھی اس استقامت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

چوتھی یہ کہ اگر کہیں مسلمان اس طرح کی مظلومیت کی حالت میں گھر جائیں تو ان تمام مسلمانوں پر جو ان کی مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ان کی مدد کے لیے نہ اٹھیں تو یہ صریح نفاق ہے۔

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ فَقَاتِلُوۡۤا

اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (۷۶)

طاغوت کے لفظ پر بحث بقرہ اور آل عمران دونوں کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہاں قرآن نے فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ کہہ کر خود واضح فرما دیا کہ طاغوت سے مراد شیطان ہے۔

یہ آیت اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کی جنگ خدا کی راہ میں ہوتی ہے اور خدا ان کے سرپر ہوتا ہے۔ برعکس اس کے اہل کفر کی جنگ شیطان کی راہ میں ہوتی ہے اور شیطان ان کے سرپر ہوتا ہے۔ گویا مقابلہ اصلاً رحمان اور شیطان کے درمیان ہوتا ہے۔ چونکہ خدا نے شیطان کو بھی ایک محدود دائرے کے اندر مہلت دی ہے اس وجہ سے وہ اپنے حامیوں کو کچھ چالیں بتاتا اور سکھاتا ہے لیکن آخر خدا کے کید متین کا مقابلہ وہ اور اس کے اولیا کیا کرسکتے ہیں؟ اس وجہ سے اہل ایمان کو ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ اگر انھوں نے خدا کی وفاداری میں کوئی کمزوری نہیں دکھائی تو بہرحال کامیابی انھی کی ہے۔

شیطان کی چالوں میں کمزوری کے جو فطری اسباب مضمر ہیں ان پر گفتگو کے لیے موزوں مقام دوسرا ہے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ کسی کام کی کوئی مضبوط بنیاد اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتی جب تک وہ بنیاد حق پر نہ ہو۔ شیطان کے ہر کام کی بنیاد چونکہ باطل پر ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے مستحکم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۷۷۔۸۵

آگے انھیں منافقین کی مزید کمزوریاں اور شرارتیں واضح کی جارہی ہیں تاکہ مسلمان ان کے فتنوں سے آگاہ ہوجائیں اور ان کی وسوسہ اندازیوں سے مسلمانوں کے اندر جو غلط اور منافی توحید و اسلام رجحانات ابھر سکتے ہیں ان کا اچھی طرح ازالہ ہوجائے۔

پہلے ان منافقین کے اس عجیب و غریب رویے پر توجہ دلائی کہ اب تک تو یہ اپنے ایمان و اخلاص کی دھونس جمانے کے لیے بہت بڑھ بڑھ کر جہاد کے لیے مطالبہ کر رہے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے ایک ایک شخص جہاد کے عشق سے سرشار ہے لیکن پیغمبر کی طرف سے ان کو صبر و انتظار کی ہدایت کی جاتی تھی کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے، ابھی نماز اور زکوٰۃ کے اہتمام کے ذریعے سے اپنے آپ کو مضبوط اور منظم کرو تاکہ وقت آنے پر پوری مومنانہ شان استقامت کے ساتھ خدا کی راہ میں لڑ سکو۔ لیکن اب جب کہ جنگ کا حکم دے دیا گیا ہے تو چھپتے پھرتے ہیں اور خدا سے زیادہ انسانوں سے ڈرتے ہیں اور شاکی ہیں کہ اتنی جلدی جہاد کا حکم کیوں دے دیا گیا ہے۔

اس کے بعد ان کو مخاطب کرکے فرمایا کہ فرائض سے فرار موت سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

موت اپنے وقت ہی پر آئے گی اور جب اس کا وقت آجائے گا تو وہ ہر شخص کو ڈھونڈھ نکالے گی خواہ وہ کتنے ہی مضبوط قلعوں کے اندر چھپا بیٹھا ہو۔

پھر منافقین کے ایک خاص ذہنی الجھاؤ سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان لوگوں کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ پیغمبرؐ جو کچھ بھی کرتے ہیں خدا ہی کے حکم اور خدا ہی کی رہنمائی میں کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر انھیں کامیابی حاصل ہو تو اس کو تو یہ خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اگر کوئی افتاد پیش آجائے تو اس کو پیغمبرؐ کی بے تدبیری کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض ان کی ناسمجھی ہے۔ خیر ہو یا شر سب خدا ہی کی مشیئت سے ظہور میں آتا ہے۔ اس کارخانۂ کائنات میں دو مشیتیں کار فرما نہیں ہیں، صرف ایک ہی کی مشیت کارفرما ہے۔ البتہ یہ بات ہے کہ شر جب ظہور میں آتا ہے تو وہ انسان کے اپنے اعمال پر مترتب ہوتا ہے۔

اس کے بعد اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اگر ان کو تمھاری رسالت کے باب میں تردد ہے تو ہوا کرے۔ بہرحال تم اللہ کے رسول ہو اور تمھاری رسالت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ اب اللہ کی اطاعت کی راہ یہی ہے کہ لوگ تمھاری اطاعت کریں، جو تمھاری اطاعت سے گریز کرنا چاہتا ہے وہ جہاں چاہے بھٹکتا پھرے، تمھارے اوپر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

پھر فرمایا کہ ان لوگوں کے دوغلے پن کا یہ حال ہے کہ جب تمھارے پاس ہوتے ہیں اور تم اللہ کی آیات اور اس کے احکام ان کو سناتے ہو تو ہر بات پر سر تسلیم خم کرتے ہیں لیکن جب تمھارے پاس سے ہٹتے ہیں تو قرآن کے خلاف آپس میں طرح طرح کی سرگوشیاں کرتے اور باتیں بناتے ہیں۔ اس کی جو باتیں اپنے اغراض و خواہشات کے خلاف پاتے ہیں انھیں اپنی نجی مجلسوں میں نکتہ چینیوں اور اعتراضات کا ہدف بناتے ہیں۔ ایک طرف قرآن کو اللہ کی کتاب بھی مانتے ہیں اور اس کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا اظہار بھی کرتے ہیں، دوسری طرف اس کی بہت سی باتوں کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ گویا انھوں نے قرآن کو بیک وقت دو ارادوں کا ملغوبہ سمجھ رکھا ہے، جس میں کچھ حصہ تو اللہ کی طرف سے ہے جسے یہ مانتے ہیں اور کچھ حصہ غیر اللہ کی طرف سے ہے جس کی یہ مخالفت کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی وحدت اور اس کی ہم رنگی و ہم آہنگی اس بات کی نہایت قطعی شہادت ہے کہ اس میں مختلف ارادوں کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ہی خدائے علیم و حکیم کا اتارا ہوا ہے۔ اگر اس میں اللہ کے سوا غیر اللہ کی بھی کوئی مداخلت ہوتی تو اس میں قدم قدم پر تناقض ہوتا اس لیے کہ دو مختلف ارادوں اور دماغوں کی لکھی ہوئی چیز میں اختلاف و تناقض کا پایا جانا لازمی ہے۔

اس کے بعد منافقین کی ایک شرارت کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ مسلمانوں سے متعلق امن یا خطرے کی کوئی بات سنتے ہیں تو اس کو لے اڑتے ہیں اور لوگوں کے اندر سنسنی پیدا کرنے کے لیے اس کو پھیلا